نہ دن رات تھے) کا استعمال یعنی اُن جیسی مخلوقات یا ان سے شباہت رکھنے والی مخلوقات کے لیے کنایہ ہے، کیونکہ لُغت بنانے والوں نے ان لفظوں کو ان مخصوص چیزوں اور کاموں کے لیے قرار دیا ہے۔ایسا نہیں کہ اُنہوں نے دنیا بننے سے قبل اِن حادثات کے لیے الفاظ وضع کر دیے ہوں۔ذرا سے غور وفکر کے بعد مولا ؑ کے کلام میں آنے والے مفاہیم کی آج کے دانشوروں کے مفروضوں اور نظریات کی روشنی میں زیادہ بہتر تفسیر یہ ہے، البتہ ہمارا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ مولا ؑ یہ فرما رہے ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ اس تفسیر کا احتمال ممکن ہے۔

ضروری وضاحت

آج کل کے مفروضوں اور نظریات (جو دنیا کے آغاز کے بارے میں کیے گئے ہیں) کے مطابق سارا عالم ایک بڑے سے گیس کے تُودے (ڈھیر) کی شکل میں تھا جو کہ مائع (یعنی بہنے والی شے) کی شبیہ تھا۔اور اُسے دُھوئیں کا نام دیا جاسکتا ہے، یا دوسری تعبیر کے مطابق، اُوپری سطح پر دُھواں تھا اور جو حصہ بھی جس قدر بھی اپنے مرکز کے قریب تر ہوتا تھا، وہ اُتنا ہی زیادہ سے زیادہ پریشر (Pressure) دباؤ کے تحت قرار پاتا اور مائع (پانی کی طرح بہنے والی کسی شے) کی صورت اِختیار کر لیتا۔

جو چیز اس عظیم تودے کو روکے ہوئے تھی، یہ وہی قوتِ جاذبہ اور کشش ثقل تھی جو تمام عالم کے ذرّات میں پائی جاتی ہے، اِس قوتِ جاذبہ نے اُس گیس (Gas) کو پکڑا ہوا تھا اور اُسے مضبوطی کے ساتھ اس کی حدود میں روکے رکھا تا کہ ہو ا اپنے مرکز سے دور نہ ہو جائے اور حدود سے باہر نہ نکل جائے، پھر اِس عظیم تودے نے اپنے ہی گرد گھومنا شروع کیا (یا تو شروع سے ہی اپنے ہی گرد گھوم رہا تھا) اِس جگہ پر قوتِ گریز پیدا ہوئی۔[1]

اپنے مرکز سے گریزاں یہ قوت اس چیز کا باعث بنی کہ گیس سے بنے ہوئے بڑے بڑے تودوں کو خالی فضا کی طرف پھینکے نہج البلاغہ کی تعبیر کے مطابق اِس دریا کی لہروں کو ہر طرف پھینکے، یا دوسری تعبیر کے مطابق جھاگ کی جو سطح بن گئی تھی اسے، حدود سے باہر بھیج دیا اور ایک وسیع اور بلند تر فضا میں اِن لہروں کو بلند کیا (اِس خطبے کے آخر میں یہی تعبیرات آئی ہیں) اور اُس سے اِس عالم کے بڑے چھوٹے کرّہ اَرض جیسے کُرّے اور کہکشائیں وغیرہ پیدا کیں یا قرآن اور نہج البلاغہ کی تعبیر کے مطابق اُس سے سات آسمان بنائے۔ہم بغیر کسی ضرر کے مذکورہ تعبیرات کو ان نظریات پر تطبیق کرنے کی بجائے اس بات

---

[1] ہر وہ شے جو اپنے ہی گرد گھومے اور کسی مرموز قوت کے تحت اپنے مرکز سے فرار کرنے پر مائل ہو، بالکل آگ کے اُس گولے کی طرح ہے، جسے ہم اپنے ہاتھوں سے گھماتے ہیں اور اچانک چھوڑ دیتے ہیں، تو وہ ایک دور دراز جگہ کی جانب چلا جاتا ہے، یہ وہی مرکز سے گریز کرنے والی طاقت ہے اور یہ جس قدر شدید تر ہو، اُس کا اُتنا ہی دور جانا ممکن ہے۔

پر اکتفا کرنا چاہتے ہیں کہ آسمانوں، منظوموں، اور کہکشانوں کی پیدائش کے بارے میں حضرت علیؑ کے جملے تمام مفروضوں اور نظریات کے افق پر پائے جاتے ہیں اور مفہوم کو واضح کرنے میں رساتر بھی ہیں اور قابل ادراک بھی۔ اب ہم حضرت علیؑ کے کلام میں دقیق اور قابل غور تعبیرات کرتے ہیں، سب سے پہلے فرماتے ہیں:

"فَأَجْرىٰ فِيهَا مَاءً مُتَلَاطِمًا [1] تَيَّارُهُ" [2]

''خدا نے اُس فضا میں جو پہلے سے پیدا کر چکا تھا، ایک پانی پیدا کیا جو جوش مارتا ہوا اور متلاطم تھا، اور اُس کی موجیں شدت کے ساتھ حرکت میں تھیں۔''

''تلاطم'' اس سے مراد لہروں کا ایک دوسرے سے ٹکرانا اور (تیار) سے مُراد ہر قسم کی لہر خاص طور پر وہ لہریں جو پانی کو باہر کی جانب پھینکتی ہیں۔''

کیا یہ جوش مارتا ہوا متلاطم پانی وہی دَبی ہوئی گیس تو نہیں جو آج کے دانشوروں کے نظریئے کے مطابق دنیا کے ابتدائی مادّے کو تشکیل دیتی ہے؟

پھر فرماتے ہیں:

"مُتَرَاكِمًا [3] زَخَّارُهُ" [4]

''یہ اِس حال میں ہوا کہ اِس جوش مارتے ہوئے دریا کی لہریں اُڑ کر ایک دوسرے پر سوار ہو جاتی تھیں۔''

پھر اضافہ فرماتے ہیں:

---

[1] مُتَلَاطِم، کا لفظ دراصل لَطْمٌ سے آیا ہے، بروَزنِ خَتم، جس کا مطلب ہے ہاتھ سے منہ پر تھپڑ مارنا، پھر یہ موجوں کے آپس میں ٹکرانے اور ایک دوسرے کو تھپیڑے مارنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

[2] تَيَّار، دَراصل دَریا کی اُن مُوجوں کو کہا جاتا ہے جو جوش مارنے کی وجہ سے پانی کو باہر کی جانب پھینکتی ہیں۔ بعض نے اِس لفظ کو ہر طرح کی موجوں اور لہروں کے لیے استعمال کیا ہے۔ (مقائیس اللُّغَة ولِسَانُ العَرَب)

[3] متراکِم کا لفظ رَکم کے لفظ سے آیا ہے جو (رَزْم) کے وَزن پر ہے، جس سے مُراد کسی چیز کا شدت سے دَرہم برہم ہو جانا ہے اور یہ لفظ پانی، ہوا، ریت اور یہاں تک کے انسانوں کے اُس ہجوم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو کسی ایک جگہ شدید رش میں گتھم گتھا ہو جائیں۔ (مغردات، لسان العرب، مقائیس اللُّغَة)

[4] زَخَّار کا لفظ ''زَخَر'' کے مادّے سے آیا ہے اور زُخور دراصل اٹھنے کے اور بلند ہونے کے معنی میں آتا ہے اور یہ سمندر اور دریا کے بھر جانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ (مفردات، لسانُ العرب، مقاییس اللُّغَة)

"حَمَلَهُ عَلٰی مَتْنِ الرِّیحِ الْعَاصِفَةِ [۱] وَالزَّعْزَعِ [۲] الْقَاصِفَةِ [۳]

''خدا نے اِس پانی کو تیز اور طوفانی ہواؤں کی پشت پر سوار کر دیا۔ اس سے مراد مارنے والی اور توڑنے والی ہوائیں ہیں۔''

"عاصِف" کوٹنے والا اور توڑنے والا کے معنی میں ہے اور "وَالزَّعْزَعِ" سے مراد بے چین اور شدید ہے۔ اور "الْقَاصِفَةِ" سے مراد بھی توڑنے والی ہے اور یہ سب الفاظ ایک کے بعد ایک، اُن تند و تیز اور طوفانی ہواؤں کی شدت کو بیان کرنے کی تاکید ہے۔

"فَاَمَرَهَا بِرَدِّهِ، وَسَلَّطَهَا عَلٰی شَدِّهِ، [۴] وَقَرَنَهَا اِلٰی حَدِّهِ"

''یہ عظیم اور وحشت ناک طوفان اِس بات پر مامور تھا کہ پانی کے موجوں کو محفوظ رکھے اور اس کے تمام حصوں کو آپس میں جوڑے رکھے اور اُسے اپنی خاص حدود میں سنبھال کر رکھے۔''

کیا یہ عظیم طوفان اور شدید موجیں، قوتِ جاذبہ کی اَمواج کی جانب اشارہ نہیں، جنہیں خداوند عالم نے سارے عالم مادّہ کے ذرّات پر مسلط کر دیا ہے جو اِن سب کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھنے کا سبب ہے اور اِن کے پھیل جانے اور بکھر جانے کی راہ میں رُکاوٹ ہے، سب کو مہار کر کے اپنی حدود میں سنبھال کر رکھتی؟ قوتِ جاذبہ کی امواج اور لہروں کے لیے اس دور میں طوفانی اور مارنے والی ہوا سے بہتر اور کون سی تعبیر ہو سکتی۔

---

[۱] عاصِفَة کا لفظ عَصْف بروزنِ عصر کے لفظ سے آیا ہے۔ جو کہ ہلکے پن اور تیزی کے معنی میں آتا ہے، اِس لیے ذرّات اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے تیزی سے اُڑ جانے اور پھیل جانے کے معنی میں آتا ہے۔ اور عاصف اور مُعصف، اُس چیز کو کہتے ہیں جو تمام اشیاء کو آپس میں درہم برہم کرے اور انہیں موم کر دے (مفردات، لسانُ العرب مقائیس اللُّغَة)

[۲] زعزع، یہ لفظ، زمزم کے وزن پر حرکت اضطراب اور بلند ہونے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی شدید کے معنی میں آتا ہے۔ ''مقاییس اللغہ، اور لسان العرب''

[۳] قاصفة، یہ لفظ، قصف، کے مادے سے (حذف) کے وزن پر ہے، جس کا معنی کسی چیز کو توڑنے کے ہے اسی لیے سمندر کی ان تند و تیز ہواؤں کو جو کشتیوں کے ٹوٹنے کا باعث بنتی ہیں۔ اور شدید طرح کے رعد و برق کو قاصفہ کہا جاتا ہے۔ (مفردات، لساب العرب اور مقاییس اللغہ)

[۴] شدّ، مد کے وزن پر کسی بھی چیز کی طاقت اور قدرت کے معنی میں آتا ہے۔ اسی وجہ سے طاقتور لوگوں خصوصاً جنگ و پیکار میں اپنا لوہا منوانے والوں، کو شدید کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ ظاہری بدن یا باطنی و روحی طاقتوں یا عذاب و مصیبت کے وقت اپنے آپ کو مضبوط اور محکم کرنے اور گرہ لگانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لسان العرب، مفردات، مقائیس اللغہ)

"اَلْهَوَاءُ مِنْ تَحْتِهَا فَتِيْقٌ [۱] وَالْمَاءُ مِنْ فَوْقِهَا دَفِيْقٌ" [۲]

یہ سب اُس وقت ہوا کہ اُس کے نیچے فضا نے اپنا دامن پھیلایا ہوا تھا اور اُس کے اوپر پانی (مائع کی شکل کی گیس) حرکت میں تھا۔

"فَتِيْقٌ" کا لفظ "فَتْقٌ" کے مادّے سے، ''کھلا'' ہونے کے معنی میں آیا ہے اور "دَفِيق" کا لفظ "دَفْقٌ" کے معنی میں آتا ہے، جس کا مطلب تیزی سے حرکت کرنا ہے۔

جی ہاں یہ جوش مارتی ہوئی موجیں، تیز ہواؤں کے ذریعے محدود جگہ میں روک دی گئیں اور اُنہیں یہ ہوائیں اپنی حدود سے تجاوز کرنے نہیں دیتی تھیں۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِن تیز وطوفانی ہواؤں کے ہوتے ہوئے وہ جوش مارتی لہریں اور امواج، پانی کی سطح میں پیدا ہی کیسے ہوئیں۔ عام طور پر موجیں اور جوش مارتی ہوئی لہریں، تیز اور طوفانی ہواؤں کے نتیجے میں بنتی ہیں جبکہ یہاں طوفان اِن لہروں کو روکنے کا کام کر رہا ہے اور اَمواج کو مہار کر رہا ہے، تو پھر آخر یہ کیا چیز ہے جو اَمواج کو متحرک اور جو ہیجان زدہ بنا رہی ہے۔

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اِن موجوں کی پیدائش کا سبب کوئی اندرونی شے تھی، جو موجوں کو جوش میں لا کر آپس میں ٹکرا رہی تھی، اگرچہ یہ بات ٹھیک طرح سے ہم پر واضح نہیں ہے کہ وہ کیا چیز تھی، مگر آج کے دانشوروں اور سائنسدانوں کے نظریات سے بالکل ہم آہنگ ہے، کیونکہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مائع نُما گیسز کے اندر کچھ ایٹمی دھماکے ہوتے رہے اور وہی دھماکے آج سورج میں ہو رہے ہیں۔ یہ بڑے بڑے دھماکے اِس گیس کے سُکون کو ختم کر کے اِس میں تلاطم اور ہیجان پیدا کر کے ٹھاٹھیں مارتی ہوئی امواج اور لہروں میں بدل دیتے ہیں۔ خطبے کے اِس حصے کو مکمل کرنے کے لیے ہمیں اِس کے آخری حصے کو اگلے موضوع کے ساتھ ملا کر غور کرنا ہوگا تاکہ مولائے کائناتؑ کے کلام کی گہرائی کو سمجھ سکیں۔

ساتواں حصّہ

ثُمَّ أَنْشَأَ سُبْحَانَهُ رِيْحًا اعْتَقَمَ مَهَبَّهَا وَ أَدَامَ مُرَبَّهَا وَ أَعْصَفَ مَجْرَاهَا وَ أَبْعَدَ مَنْشَأَهَا فَأَمَرَهَا بِتَصْفِيقِ الْمَاءِ الزَّخَّارِ وَ إِثَارَةِ مَوْجِ الْبِحَارِ فَمَخَضَتْهُ مَخْضَ السِّقَاءِ وَ عَصَفَتْ بِهِ عَصْفَهَا بِالْفَضَاءِ تَرُدُّ أَوَّلَهُ [عَلَى] إِلَى آخِرِهِ وَ سَاجِيَهُ [عَلَى] إِلَى مَائِرِهِ حَتَّى عَبَّ عُبَابُهُ وَ رَمَى بِالزَّبَدِ رُكَامُهُ

---

[۱] فتیق کا لفظ فَتْق کے مادّے سے آیا ہے جس کا ترجمہ ہو چکا۔

[۲] دفیق کا لفظ دَفْق کے لفظ سے آیا ہے اور دَفْن کے وَزن پر ہے اور یہ کسی چیز کو آگے بڑھانے اور پھینکنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور تیزی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ تیز چلنے والے اُونٹ کو اَدفق کہتے ہیں۔

فَرَفَعَهُ فِي هَوَاءٍ مُنْفَتِقٍ وَ جَوٍّ مُنْفَهِقٍ فَسَوَّى مِنْهُ سَبْعَ سَمَوَاتٍ جَعَلَ سُفْلَاهُنَّ مَوْجاً مَكْفُوفاً وَ عُلْيَاهُنَّ سَقْفاً مَحْفُوظاً وَ سَمْكاً مَرْفُوعاً بِغَيْرِ عَمَدٍ يَدْعَمُهَا وَ لَا دِسَارٍ يَنْظِمُهَا ثُمَّ زَيَّنَهَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ وَ ضِيَاءِ الثَّوَاقِبِ وَ أَجْرَى فِيهَا سِرَاجاً مُسْتَطِيراً وَ قَمَراً مُنِيراً فِي فَلَكٍ دَائِرٍ وَ سَقْفٍ سَائِرٍ وَ رَقِيمٍ مَائِرٍ۔

''اس کے بعد ایک اور ہوا ایجاد کی جس کی حرکت میں کوئی تولیدی صلاحیت نہیں تھی اور اسے مرکز پر روک کر اس کے جھونکوں کو تیز کر دیا اور اس کے میدان کو وسیع تر بنا دیا اور پھر اسے حکم دیدیا کہ سمندر کے پانی کو آپس میں ٹکرا دے اور موجوں کو الٹ پلٹ کر دے۔ چنانچہ اس نے سارے پانی کو ایک مشکیزہ کی طرح انڈیل دیا اور اسے فضائے بسیط میں اس طرح لے کر چلی کہ اوّل کو آخر پر الٹ دیا اور ساکن کو متحرک پر پلٹ دیا اور اس کے نتیجے میں پانی کی ایک سطح بلند ہوگئی اور اس کے اوپر جھاگ کی ایک تہہ بن گئی۔ پھر اس جھاگ کو پھیلی ہوئی ہوا اور کھلی ہوئی فضا میں بلند کر دیا اور اس سے سات آسمان پیدا کر دیے، جس کی نچلی سطح ایک ٹھہری ہوئی موج کی طرح تھی اور اوپر کا حصہ ایک محفوظ سقف (چھت) اور بلند عمارت کی مانند تھا۔ نہ اس کا کوئی ستون تھا جو سہارا دے سکے اور نہ کوئی بندھن تھا جو منظم کر سکے۔ پھر ان آسمانوں کو ستاروں سے مزین کیا اور ان میں تابندہ نجوم کی روشنی پھیلا دی اور ان کے درمیان ایک ضوفگن چراغ اور ایک روشن ماہتاب روشن کر دیا جس کی حرکت ایک گھومنے والے فلک اور ایک متحرک چھت اور جنبش کرنے والی تختی میں تھی۔''

شرح وتفسیر

دنیا کی پیدائش میں طوفانوں کا کردار

مولاؑ کے کلام کا یہ حصہ جیسا کہ اشارہ ہوا، پچھلے فقروں سے جڑی ہوئی ایک اور تکمیلی بحث ہے۔ اِس مقام پر ہم بغیر کسی تمہید کے کلام کی عمیق و گہری اور قابل غور تعبیرات سے آغاز کرتے ہیں اور اس کے بعد اِن باتوں کا موجودہ دور کے سائنسدانوں کی باتوں سے ملا کر موازنہ کریں گے کہ کس طرح حضرتؑ کا کلام آج کے سائنسدانوں کے علمی نتائج کے قریب ہے۔ امامؑ اِس حصّے میں چند مراحل کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے پہلے مرحلے میں فرماتے ہیں:

"ثُمَّ اَنْشَأَ سُبْحَانَهُ رِيحاً اِعْتَقَم [۱] مَهَبَّهَا" [۲]

''خداوند سبحان نے ایک اور طوفان ایجاد کیا (جو کہ چار ایسی خصوصیات کا حامل تھا، جن کے ہوتے ہوئے وہ طوفان ہمارے کرۂ ارض کے عام طوفانوں سے جدا نظر آتا ہے) جو بار آور نہیں تھا'' نہ وہ بادل تھا، جو آپس میں پیوندگی کا کام دے اور بارش برسائے اور نہ گیلی مٹی تھا جو بار آور کر دے۔ (ایسی ہوا جو پانی کے ساتھ تھی اور اُس سے جُدا نہیں ہوتی تھی)

"وَاَدَامَ مُرَبَّهَا" [۳]

''عام ہواؤں کے برخلاف جو کہ دائمی نہیں ہیں یعنی کبھی چلتی ہیں اور کبھی تھم جاتی ہیں۔''

"وَاَعْصَفَ [۴] مَجْرَاهَا"

''وہ ہوا جس کے چلنے کی قوت بہت پُر قدرت اور طاقتور تھی۔''

عام ہواؤں کے مقابلے میں یہ ہوا وہ ہے جو دور سے پوری قدرت سے چلتی ہے۔

"وَاَبْعَدَ مَنْشَاهَا"

ایسی ہوا جو دور کے مقامات سے چلتی تھی۔'' معمولی ہواؤں کی طرح نہیں جو قریب سے اُٹھتی ہیں۔

دوسرے مرحلے میں اس ہوا کے کام کی جانب اشارہ فرماتے ہیں:

"فَاَمَرَهَا بِتَصْفِيْقِ [۵] الْمَاءِ الزَّخَّارِ"

''اسے حکم دیا کہ گہرے اور پھیلے ہوئے پانی کو لگاتار تہ و بالا کرے۔''

---

[۱] اعتقم کا لفظ عُقم کے مادّے سے آیا ہے بروزنِ قُفل۔ اِس کا مطلب ہے وہ خشکی جو کسی بھی اثر کو قبول نہ کرے۔ اور عَقیم اُس عورت کو کہا جاتا ہے جو صاحب اولاد نہیں ہوسکتی انسانی اور مرد کے نطفے کو قبول نہیں کرتی اور مزید یہ ہے کہ تنگی کے معنی میں بھی استعمال ہوا کرتا ہے۔ (مفردات، لسانُ العرب، مقائیس اللغة)

[۲] مَهَبّ، کا لفظ هُبوب کے مادّے سے ہے بروزنِ سجود، جس کے معنی بیدار ہونے اور تلوار کے متحرک ہونے کے بھی ہیں اور کلی طور پر ہیجان انگیز ہونے کو بھی کہا جاتا ہے لہٰذا ہوا کے چلنے پر بھی اِس لفظ کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

[۳] مُرَبّ کا لفظ رَبّ سے آیا ہے اور دراصل اس کے معنی تربیت کے ہیں اور مُرَبّی، مالِک اور خالق کو بھی رَبّ کہا جاتا ہے۔ (یہ ایسا مصدر ہے جو فاعل کا معنی رکھتا ہے) اور جب یہ بابِ افعال سے آئے یعنی ''ارباب'' پڑھا جائے تو اس کے معنی اِستمرار اور لزوم کے ہوں گے۔ (کیونکہ تربیت بھی باقاعدگی اور اِستمرار کے بغیر ممکن نہیں) اِس بنا پر مُرَبّ جو کہ مصدرِ میمی ہے، یہ دوام اور بقا کے معنی میں ہے۔

[۴] أَعْصَفَ کا لفظ عَصف کے لفظ سے آیا ہے جو کہ عصُر کے وزن پر ہے جیسا کہ ہم کہہ چکے یہ تیزی، حرکت، اور شدّت کے معنی میں آیا کرتا ہے۔

[۵] تصفیق کا لفظ صَفْق کے مادّے سے آیا ہے، بروزنِ سَقف۔ اس کا مطلب ہے کسی چیز کو دوسری چیز پر اس طرح سے مارنا کہ کوئی آواز آئے۔ اِسی رُو سے تالی بجانے کو بھی، تَصفیق، کہا جاتا ہے اور یہاں پر پانی کو پانی پر مارنے اور ٹکرانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (لِسانُ العرب، مقائیسُ اللُّغَة، شرح عَبدہ)

"وَاَثَارَةِ مَوْجِ الْبِحَارِ"

''اور پھر اُن بڑے بڑے سمندروں کی لہروں کو ہر طرف ساتھ پھیلا دیا۔''

"فَمَخَضَتْهُ [۱] مَخْضَ السِّقَاءِ"

''اس عظیم طوفانی ہوا نے اُس ڈھیر سارے پانی کو سقاؤں کی مشک کی طرح ایک دوسرے پر مارا۔''

"وَعَصَفَتْ بِهِ عَصْفَهَا بِالْفَضَاءِ"

''اور اُسے بڑی شدت کے ساتھ فضا میں بلند کیا۔''

"تَرُدُّ أَوَّلَهُ إِلٰى آخِرِهِ وَسَاجِيَهُ [۲] إِلٰى مَائِرِهِ" [۳]

''یہ تیز طوفانی ہوائیں اِس پانی کے پہلے حصّے کو اس کے آخری حصّے سے ملا دیتی تھیں اور اس کے ٹھہرے ہوئے خطوں کو متحرک حصوں کی طرف لے جاتی تھیں۔''

تیسرے مرحلے میں فرماتے ہیں:

"حَتّٰى عَبَّ عُبَابُهُ" [۴]

''تمام پانی آپس میں مل کر جوش میں آئے اور اوپر کی جانب اُٹھنے لگے۔''

"وَرَمٰى بِالزَّبَدِ رُكَامُهُ" [۵]

اور پانی کے جوش مارتے ہوئے حصّے نے اپنے اندر کے جھاگ کو ہوا میں اُچھالا۔

چوتھے مرحلے میں فرماتے ہیں:

---

[۱] مَخَضَ کا لفظ مخض کے مادّے سے آیا ہے بروزنِ قرض ہے۔ درحقیقت یہ مائع (بہنے والی) اَشیاء کو اُن کے برتنوں میں ہلانے کے معنی میں آتا ہے، اِسی لیے جب مشک میں دہی کو ہلایا جاتا ہے تا کہ اُس کا مکھن الگ ہو جائے۔ اُس میں بھی یہی تعبیر استعمال ہوتی ہے۔

[۲] "ساجی" کا لفظ سجو کے مادّے سے سہو کے وزن پر ہے۔ اس لفظ کے معنی سکون اور ٹھہراؤ کے ہیں۔

[۳] "مائر" کا لفظ مور کے مادّے سے آیا ہے۔ بروزن فور، دراصل یہ کسی چیز کے رفتار تیز ہونے کے معنی میں آتا ہے، یہ لفظ سڑک کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ لوگ اور گاڑیاں اس پر تیزی سے آمد و رفت کرتی ہیں۔

[۴] "عُباب" کا لفظ عب کے مادّے سے آیا ہے، جس کے معنی ہیں پانی کو تیزی سے اور بغیر وقفے کے پینا۔ اسی لیے بہت سارے پانی کو، زیادہ بارش ہونے کو اور بڑے سیلاب کو عباب کہتے ہیں اور یہ یہاں پر بہت سارے پانی کا آپس میں ایک موج کا دوسری موج کو پچھاڑنے کے معنی میں آیا ہے۔

[۵] ''رکام'' جوش و خروش میں آنے کو کہتے ہیں۔

"فَرَفَعَهُ فِیْ هَوَاءٍ مُنْفَتِقٍ وَجَوٍّ مُنْفَهِقٍ"[۱]

''خداوند عالم نے اس جھاگ کو ایک وسیع اور کشادہ فضا کی جانب اوپر کی طرف اٹھایا۔''

"فَسَوّٰی مِنْهُ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ"

''اور اس سے سات آسمانوں کو خلق کیا۔''

"جَعَلَ سُفْلَاهُنَّ مَوْجًا مَکْفُوْفًا[۲] وَعُلْیَاهُنَّ سَقْفًا مَحْفُوْظًا وَسَمْکًا[۳] مَرْفُوْعًا"

''جب کہ اُس کے نچلے حصوں کو کسی مہار شدہ موج کی مانند قرار دیا اور اوپر کے حصوں کو کسی محفوظ اور بلند چھت کی مانند بنایا۔''

"بِغَیْرِ عَمَدٍ[۴] یَدْعَمُهَا[۵] وَلَا دِسَارٍ یَنْظِمُهَا"[۶]

اس حال میں کہ کوئی ایسا ستون نہیں تھا جو اُسے روکے رکھے اور نہ کوئی کیل ایسی تھی جو اُسے باندھ کر ایک جگہ ٹکا دے۔''

پانچویں اور آخری مرحلے میں فرماتے ہیں:

"ثُمَّ زَیَّنَهَا بِزِیْنَةِ الْکَوَاکِبِ وَضِیَاءِ الثَّوَاقِبِ"[۷]

''پھر خدا نے آسمانوں کو ستاروں اور ان کی روشنی سے آراستہ کیا۔''

---

[۱] "منفهق" کا لفظ ،فَهِقَ، کے مادّے سے ،فرق کے وزن پر ہے۔اس کے معنی پھیلاؤ اور وسعت کے ہیں اور اسی وجہ سے پانی کے برتن کو اور پہاڑوں کے درمیانی راستے کو اگر وہ چوڑا ہو تو اُسے بھی منفھق کہتے ہیں۔

[۲] مکفوف، کا لفظ ،کف، کے مادّے سے ہے، سد کے وزن پر ہے، یہ قبض و انقباض ہتھیلی کو بھی کف کہا جاتا ہے کیوں کہ معمولاً لین دین کا تعلق ہتھیلی سے ہوتا ہے۔اسی طرح نابینا شخص کو بھی مکوف کہا جاتا ہے، کیوں کہ اس کی آنکھیں بند ہوئی ہیں کے معنی میں آتا ہے۔

[۳] سمك دراصل بلندی اور اونچائی کے معنی میں آتا ہے اور گھر کی چھت کو بھی سمک کہتے ہیں کیونکہ وہ اٹھی ہوئی اونچی ہوتی ہے۔

[۴] عمد بروزن سبد اور عمد بروزن شُتُر دونوں عمود کی جمع ہیں جو کہ ستون کے معنی میں آتے ہیں۔

[۵] یدعم ، کا لفظ ،دعم، کے مادّے سے فهم کے وزن پر ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو کھڑا رکھنا۔ دعام اور، دعامۃ، کے معنی وہ لکڑیاں ہیں جن کے ذریعے کسی کو دار، سولی پر لٹکایا جاتا ہے اور یہ لفظ ہر اُس چیز پر صادق آتا ہے جو اِس کام میں شریک ہو، اور سولی پر لٹکانے والا شخص بھی اسی کے زمرے میں آتا ہے۔

[۶] دسار، کیل کے معنی میں ہے اور اسی طرح سے وہ رسی بھی کہلائی جاسکتی ہے کہ جس سے کسی چیز کو مضبوطی سے باندھا جائے۔

[۷] ثواقب، کا لفظ ،ثقب، کے مادّے سے جو سقف کے وزن پر ہے، اس کے معنی سوراخ کرنے، پھاڑنے اور کسی چیز میں نفوذ کرنے کے ہیں اور درخشاں ستاروں کو اسی لیے ثواقب کہا جاتا ہے کیونکہ وہ آسمان کو چیرتے ہوئے ہم تک روشنی پہنچاتے ہیں اور ان کی روشنی اور چمک آنکھوں میں نفوذ کر جاتی ہے۔

"وَ أَجْرِى فِيهَا سِرَاجاً مُسْتَطِيراً [1] وَ قَمَراً مُنِيراً فِي فَلَكٍ دَائِرٍ وَ سَقْفٍ سائِرٍ وَ رَقِيمٍ [2] مائِرٍ"

''اور اُس میں ایک روشن اور نور افشاں چراغ (خورشید) اور ایک روشن چاند ایک متحرک محور پر گھومتی ہوئی چھت اور ہلتے ہوئے صفحے پر متحرک کر دیا۔''

چند نکات

اس موضوع پر جدید نظریات

آج کے دانشور اس دنیا کی خلقت کے بارے میں بہت سے خیالات رکھتے ہیں، کیونکہ کروڑوں سال پہلے کوئی نہیں تھا جس نے اس دنیا کی خلقت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو،لیکن بہر حال کچھ ایسے قرینے بھی موجود ہیں جو ان بعض مفروضوں اور نظریات کی بھر پور تائید کرتے ہیں اور جو تعبیرات مولاؑ کے کلام میں آئی ہیں، وہ آج کے معروف نظریات سے مشابہت رکھتی ہیں، جن میں سے کچھ ذکر کی جارہی ہیں،مگر اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ مولاؑ کا فرمان اور سائنسدانوں کے نظریات بالکل ایک ہیں، البتہ ممکن ہے ایسا ہو۔ جیسا کہ ذکر ہوا کہ یہ دنیا شروع میں مختلف قسم کی گیس کا دھواں تھا جو کہما ئعات سے بھی مشابہت رکھتا تھا اور اُسے قرآن کے مطابق ''دُخان'' یعنی دھواں کہا گیا ہے۔ خداوند عالم نے ان پر دو عظیم طاقتوں کو مسلط کیا جنھیں دو ہواؤں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلی قوتِ جاذبہ جو ان گیسوں کو ملا کر اور جوڑ کر رکھتی تھی اور اپنی کشش کی قوت سے اُسے بکھرنے نہیں دیتی تھی اور دوسری قوت دافعہ تھی جو اپنے ہی گرد گھوم کر قوت گریز (یعنی مرکز سے دور کرنے کی قوت) کو ایجاد کرتی تھی اور اسے باہر کی جانب دھکیلتی تھی۔

یہ ہی دوسرا طوفان تھا جو نہایت شدید اور طاقتور تھا۔ اگر ہم یہ مان لیتے ہیں کہ اس کائنات کے آغاز سے اب تک اس میں مختلف قسم کی گردشیں واقع ہوتی رہی ہیں تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ گردش کبھی شدید اور کبھی ہلکی اور معمولی بھی رہی ہو گی۔ یہ بات بھی لازمی ہے کہ اُس مائع نما، بہنے والی چیزوں کی گیس کے اندر جو موجیں اور لہریں پائی جاتی تھیں، ان میں طرح

[1] مستطیر، کا لفظ ،طیر، کے مادّے سے آیا ہے جس کے کا اصلی معنی کسی بھی چیز کا ہوا میں ہلکا ہونا ہیں۔ اس کے بعد ہر تیز چیز کے لیے استعمال ہوا ہے جیسے کہ پرندے جبکہ،مستطیر ، پھیلے ہوئے اور کشادہ کے معنی میں ہے۔ طلوع صبح کے اس وقت پر بھی صادق آتا ہے جب صبح کی روشنی آسمان پر چمکتی ہے۔

[2] رقیم، کا لفظ ،رقم، کے لفظ سے بروزن رزم ہے، اصل میں یہ خط و کتابت کے معنی میں ہے اور رقیم کا مطلب ہے صفحہ آسمان کہ وہ کسی کتاب کے صفحے کی مانند ہے اور ستاروں کے نقش و نگار سے پھیلا ہوا ہے، اسے ہی رقیم کہا جاتا ہے۔

طرح کے جوش وخروش بھی ظاہر ہوتے ہوں گے اور کبھی وہ موجیں ایک دوسرے پر تھپیڑے کی شکل میں گرتی پڑتی بھی رہی ہوں گی۔ بالآخر جو حصے ہلکے اور کم وزن تھے، جنہیں مولاؑ کے کلام میں (کف) جھاگ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ بیرونی فضا کی جانب پھینکے گئے ہوں گے۔ (یاد رہے کہ زبد پانی کے اوپر کے جھاگ کو بھی کہا جاتا ہے اور مشک کے اندر کی چار دیواری پر ظاہر ہونے والی چربی اور مکھن کو بھی کہا جاتا ہے) اس طرح ایک اور گول حرکت شروع ہوئی اور ایک بڑا تودہ اوپر کی فضا میں اُچھلا اور اس سے نکلنے والے حصوں میں جن میں زیادہ شدت تھی، وہ مزید اوپر اور آگے سے آگے کے مقامات تک جا پہنچے اور جن میں شدت کم تھی، وہ نچلے حصوں تک ہی جا کر رک گئے۔ مگر وہ جو زیادہ دور کے مقامات تک گئے، وہ بھی قدرتِ جاذبہ کی وجہ سے مکمل طور پر فرار نہ کر سکے اور ایک محفوظ چھت کی صورت اختیار کر گئے اور نچلے حصے ہلکے دباؤ والی موجیں تھیں، جنہیں موجِ مکفوف سے تعبیر کیا ہے۔

اور اس طرح سات آسمان (جن کی تفصیلی بحث بعد میں آئے گی) اس وسیع اور کھلی فضا میں ظاہر ہو گئے، جن کو کھڑا رکھنے کے لیے کسی ستون اور کیل اور رسّی کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ صرف یہ قوت جاذبہ اور دافعہ کی عادلانہ تقسیم تھی، جس نے انہیں اپنے اپنے مقامات پر روکے بھی رکھا اور ان کے اپنے اپنے مرکز پر متحرک بھی رکھا۔ اُس وقت پوری فضا چھوٹے بڑے کُرّوں (گولوں) اور انواع واقسام کے ان ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی، جو ان موجوں کے دباؤ اور شدت کی وجہ سے چاروں طرف پھیل گئے تھے، پھر بتدریج چھوٹے قطعات اور ٹکڑے قوتِ جاذبہ کے حکم پر بڑے کرّوں سے جا ملے اور یوں پوری فضا کی صفائی ہوگئی اور ستارے چمکنے لگے، جو باعث زینت بن گئے جبکہ چاند اور سورج کی روشنی گرمی اور حرارت پیدا کرنے کا باعث بنی اور ہر چیز اپنے مخصوص خط (سمت) پر گردش کرنے لگی۔

بعض موجودہ سائنسی مفروضوں اور نظریات میں سے ایک یہ ہے کہ اس دنیا کے بننے کی وجہ ایک بہت بڑا ایٹمی اندرونی دھماکا تھا جس کی وجہ سے ہر طرف مختلف قسم کے ٹکڑے اور ذرّات پھیل گئے، جن سے پھر چاند، سورج، ستارے اور سیّارے وغیرہ بن گئے۔ اور مختلف کہکشائیں بن گئیں۔ البتہ کسی نے اب تک یہ معیّن نہیں کیا کہ یہ دھماکا اصل میں کہاں سے ہوا تھا اور اس کے اسباب کیا تھے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ دھماکا گیس کے بڑے بڑے تودوں اور ٹکڑوں میں ہوا جو کہ دیکھنے میں پانی کی طرح تھے۔ اس دھماکے سے ٹکڑے فضا میں اُڑے اور کہکشائیں بن گئیں۔ ممکن ہے کہ مولاؑ کے کلام کا یہ فقرہ، اسی بڑے دھماکے کی طرف نشاندہی کر رہا ہو کہ (تیز ہوائیں اور طوفان چلنے لگے جس کا آغاز ایک دور دراز نقطہ تھا اور اس نے پانی کو شدت سے درہم برہم کر کے اتنا ٹخا کہ اس میں سے جھاگ ظاہر ہوا۔

بہر حال ان سب وضاحتوں کا مقصد جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا، صرف موجودہ سائنسی انکشافات اور نظریات سے

تطبیق کرنا اور موازنہ کرنا ہے تا کہ ہم اِس دنیا کی خلقت کو اس خطبے اور سائنسی نظریات کی روشنی میں سمجھ سکیں اور یہ کوئی حتمی اور یقینی بات نہیں ہے۔

دنیا کیسے خلق ہوئی؟

وہ پیچیدہ مسائل جن میں آج بھی تمام سائنسدان اُلجھے ہوئے ہیں، ان میں سے ایک مسئلہ اِس دنیا کی خلقت کی کیفیت کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ جو کروڑوں اربوں سال پہلے سے متعلق ہے اور شاید کسی انسان کے وہم وگمان میں بھی نہیں آ سکتا ۔اسی وجہ سے بڑے بڑے سائنسدانوں اور دانشوروں نے تمام تر مفروضوں اور خیالی نظریات کا اظہار کرنے اور دقیق ترین اور عمیق ترین مطالعات کرنے کے بعد بھی عاجزی اور ناتوانی کا اظہار کیا ہے، مگر انسان کی تجسّس سے بھرپور رُوح اُسے چپ رہنے کی اجازت نہیں دیتی۔ درحقیقت دانشوروں اور سائنسدانوں کی زبانِ حال یہ ہے کہ اگرچہ ہم اس موضوع کی انتہا تک نہیں پہنچ سکے، مگر پھر بھی اس بارے میں کچھ شبہات اور خیالی مفروضوں کو روشن کر کے اپنی بے چین روح کو کسی حد تک سیراب کر سکتے ہیں۔

آیات وروایات میں بھی اس موضوع پر سوائے کچھ اشاروں کے اور کچھ نہیں ملتا کہ جس سے موضوع مکمل طور پر واضح ہو جائے اور شاید اس مسئلے کا تقاضا بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

بہرحال جو کچھ اس خطبے میں دنیا کی خلقت اور تخلیق کے بارے میں آیا ہے، وہ خطبہ نمبر ۲۱۱ میں بھی ہے کہ مولاؑ نے فرمایا:

"وَكَانَ مِنِ اقْتِدَارِ جَبَرُوْتِهِ وَ بَدِيْعِ لَطَائِفِ صَنْعَتِهِ اَنْ جَعَلَ مِنْ مَاءِ الْبَحْرِ الزَّاخِرِ الْمُتَرَاكِمِ الْمُتَقَاصِفِ يَبَساً جَامِداً ثُمَّ فَطَرَ مِنْهُ اَطْبَاقاً فَفَتَقَهَا سَبْعَ سَمٰوَاتٍ بَعْدَ اِرْتِتَاقِهَا"

''اُس کی قدرت، جبروت اور اُس کی صنعت کے بدیع لطائف میں سے ایک یہ تھا کہ اُس نے موجوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے پانی سے ایک جامد مخلوق بنائی، پھر اُس میں کچھ طبقے بنائے اور مل جانے کے بعد اُنہیں ایک دوسرے سے الگ کیا اور یوں سات آسمانوں کو خلق فرمایا۔''[1]

اسلامی تعلیمات میں بھی اِس بارے میں بہت سے مطالب پائے جاتے ہیں اور بہت سی روایات، نہج البلاغہ سے

---

[1] ان روایات سے مزید آگاہی کے لیے بحار الانوار، جلد ۳، ۱۰، اور ۵۷ (طبع بیروت) کا مطالعہ فرمائیں، ان میں سے زیادہ تر روایات جلد نمبر ۵۷ میں موجود ہیں۔

مطابقت رکھتی ہیں، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ اُن میں یہ ملتا ہے کہ پہلے پانی پر کچھ جھاگ بنا اور اُس جھاگ میں سے کچھ دھواں اُٹھا اور اُس سے سات آسمان خلق ہوئے۔

مگر جیسا کہ بتایا گیا، ان تمام روایات میں کہیں بھی دوسری روایت کی مخالفت نہیں ہے، کیونکہ سب سے پہلا جو مادّہ تھا وہ دراصل پانی کی طرح ایک گیس تھی جس میں شدید دباؤ پایا جاتا تھا۔ اب اس کے لیے پانی، دھواں، بخارات وغیرہ کے جیسے مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں، مگر اصل مطلب ایک ہی ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجّہ ہے ان تمام روایات میں کوئی تضاد نہیں، جو یہ کہتی ہیں کہ خدا نے سب سے پہلی چیز جو خلق کی وہ پانی تھا یا یہ کہ سب سے پہلی چیز جو خدا نے خلق کی وہ نورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھا، یا پہلی مخلوق عقل تھی، وغیرہ۔ کیونکہ ان میں سے بعض روایات عالمِ مادّہ کو دیکھتے ہوئے بیان کی گئی ہیں اور بعض روایات عالمِ مجردات اور عالمِ ارواح کے حوالے سے ہیں۔ جو کچھ بیان ہوا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان روایات اور سورۂ فصلت (سورۂ حمٓ السجدہ) کی اس آیت میں بھی کوئی فرق نہیں ہے "ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ"[۱]
''پھر آسمان کی طرف متوجّہ ہوا، جبکہ وہ دھوئیں کی صورت تھا۔''

نزولِ قرآن کے دور میں تخلیق کائنات کے متعلق مفروضے

قابلِ ذکر بات تو یہ ہے کہ جس جگہ قرآن نازل ہوا یا بہتر لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا، تخلیق کائنات کے بارے میں اُس وقت بھی دو نظریے پائے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک نظریہ (بطلیموس) کے گروہ کا تھا، جو تقریباً پندرہ سو (۱۵۰۰) سال تک علمی دنیا پر حاکم رہا اور یہ عقیدہ کئی صدیوں تک چلتا رہا۔ اس مفروضے کے مطابق زمین سارے جہاں کا مرکز تھی اور اُس کے گرد نو (۹) فلک گھوم رہے تھے۔ تمام افلاک پیاز کے چھلکوں کی طرح اور شیشے کی طرح صاف شفاف اور ایک دوسرے کے اوپر تھے۔ اور گھومنے والے ستارے عطارد، زھرہ، مریخ، مشتری اور زحل، کسی نہ کسی فلک میں اور چاند، سورج دونوں اپنے اپنے فلک سے تعلق رکھتے تھے، ان سات افلاک کے علاوہ ایک فلک ایسا تھا جو ثابت ستاروں کا فلک تھا۔ (ثابت ستاروں سے مراد وہ ستارے ہیں جو ایک ساتھ طلوع کرتے اور ایک ساتھ غروب کرتے ہیں اور آسمان پر اپنی جگہ تبدیل نہیں کرتے، یہ ستارے اُن پانچ ستاروں سے بالکل مختلف ہیں جن کے نام ذکر کیے گئے) آٹھواں فلک، یعنی فلکِ ثوابت تھا اور اس کے بعد فلک اطلس تھا، ایسا فلک جس میں کوئی ستارہ نہیں تھا اور اُس کا کام پورے جہاں کو زمین کے گرد گھمانا تھا اور اُس کا نام فلک الافلاک تھا۔

---

[۱] سورۂ فصلت (سورۂ حمٓ سجدہ): آیت ۱۱

اگلا مفروضہ، عقول عشرہ کا مفروضہ تھا جو کہ خود ''بطلیموس'' کے نظریے سے (جو فطرت کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے) مدد لیتا ہے۔ یہ نظریہ جو یونانی فلسفیوں کا بنایا ہوا تھا، اس کے مطابق خداوند عالم نے سب سے پہلے عقل اوّل کو بنایا اور اُس کے سوا کچھ نہیں بنایا۔ عقلِ اوّل کسی فرشتہ یا عظیم روح یا مجرد مخلوق کو کہا گیا تھا، اس عقل نے دو چیزیں خلق کیں۔ عقلِ دوّم اور نواں فلک۔ پھر عقلِ دوّم نے عقلِ سوّم اور آٹھویں فلک کو خلق کیا اور اسی ترتیب سے دس (۱۰) عقلیں اور نو (۹) فلک بنائے گئے اور گویا عقل نے سارے جہاں کو پیدا کیا۔

البتہ ان فرضی مراتب کا سلسلہ درحقیقت بے دلیل اور بے بنیاد تھا۔ اگرچہ ''بطلیموس'' کا مفروضہ بھی بے دلیل تھا، مگر جیسا بھی تھا، بہر حال کئی صدیوں تک لوگوں کے افکار پر حکومت کرتا رہا، مگر قرآن مجید اور اسلامی تعلیمات نے نہ تو پہلے مفروضے کو قبول کیا اور نہ ہی دوسرے مفروضے کو، کیونکہ قرآنی آیات اور معروف روایات، خاص طور پر نہج البلاغہ میں ان افکار کے کوئی آثار نظر نہیں آتے بلکہ ان کی تردید ہے اور یہ خود قرآن کریم اور اسلامی روایات کی عظمت اور استقلال کی دلیل ہے، کیوں کہ ان تعلیمات کا آغاز افکار بشر کے آغاز سے نہیں، بلکہ مبداء وحی سے ہے، ورنہ انہی کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتیں۔ [1] دنیا کی پیدائش کی کیفیت کو کلامِ امیر المومنینؑ میں ملاحظہ کیا، جو کہ بہت سی دیگر روایات میں بھی ملتی ہے۔

جو کچھ قرآن میں اور روایات میں ملتا ہے وہ سات آسمانوں کا تذکرہ ہے، نہ نو (۹) افلاک اور نہ ہی دس (۱۰) عقلوں کی بات ہے اور رہی سات آسمانوں کی تفصیل تو وہ آگے ذکر ہوگی۔

مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ نہج البلاغہ کے بہت سے قدیم شارحین جو کہ عقولِ عشرہ کے مفروضے اور ''بطلیموس'' کے نظریے سے متاثر تھے، اُنہوں نے ان نظریات اور مفروضاتِ باطلہ کو نہج البلاغہ کی شرح میں گھسیٹ لیا اور مولائے کائناتؑ کے کلام کو اُن نظریات سے ملانے کی کوشش کی، جو کہ محض فرضی اور خیالی باتیں تھیں اور اُن کے نقل کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی، کیوں کہ یہ ایسے مفروضے تھے جن کا باطل ہونا آج ثابت ہو چکا ہے۔

آج کے علمی مشاہدات اور فلکی دانشوروں اور سائنسدانوں کے تجربوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ فلک کے بارے میں جو ''بطلیموس'' سمجھ رہا تھا، موجود ہی نہیں اور گھومنے والے اور ثابت ستاروں کی تعداد بھی اُن سے کئی گنا زیادہ ہے۔ جیسا کہ پہلے کے لوگ سمجھتے تھے۔ خالی فضا میں تمام سیارے زمین کے گرد نہیں بلکہ سورج کے گرد گھوم رہے ہیں اور ساتھ ہی اپنے اپنے

---

[1] بلکہ بہت سی قرآنی آیات زمین کی حرکت کی جانب اشارہ کر رہی ہیں، جیسے کہ سورۂ نمل کی آیت نمبر: ۸۸ ''وَ تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّ هِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ'' اور سورۂ مرسلات کی آیت نمبر: ۲۵ ''اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا'' بعض تفسیریں اور بعض آیات چاند، سورج عالم بالا کی فضا میں شناور ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ جیسے کہ سورۂ یاسین کی آیت: ''لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝'' (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کا مطالعہ کیجیے)

محور کے گرد گھوم رہے ہیں اور زمین نہ صرف یہ کہ مرکز جہاں نہیں ہے بلکہ یہ بھی اپنی ذات میں ایک چھوٹا سا سیارہ ہے جو اپنے نظامِ شمسی کے سیاروں میں سے ایک ہے اور یہ نظامِ شمسی بھی لاکھوں کروڑوں نظاموں میں سے ایک بہت چھوٹا نظام ہے۔مگر عقولِ عشرہ کے طرفداروں نے باوجود اس کے کہ اپنی ایک ٹانگ ''بطلیموس'' کے نظریے میں اٹکائی ہوئی ہے، جو آج باطل ہو چکا ہے، بلکہ اپنی دوسری ٹانگ بعض من پسند عقلی قاعدوں میں اٹکائی ہوئی ہے جیسے کہ "اَلْوَاحِدُ لَا یَصْدُرُ مِنْهُ اِلَّا الْوَاحِدُ" کا قاعدہ جس کی تشریح کا یہ مقام نہیں ہے۔البتہ یہ قاعدہ بھی سائنسدانوں اور دانشوروں کی اکثریت کے نزدیک دلائل کے لحاظ سے اُدھورا اور کمزور ہے۔لہٰذا عقولِ عشرہ جیسے نظریے کا اکلوتا سہارا بھی ختم ہو جاتا ہے۔[۱]

سات آسمانوں سے مراد کیا ہے؟

سات آسمانوں کا تذکرہ قرآن کے علاوہ اس خطبے میں یا نہج البلاغہ کے دوسرے خطبوں میں (خطبہ نمبر ۱۱ ۲ وغیرہ میں) آیا ہے۔[۲]

جدید اور قدیم دانشوروں کے درمیان سات آسمانوں کے بارے میں مختلف تفسیریں پائی جاتی ہیں، جن کی وضاحت اور بحث کی یہاں پر گنجائش نہیں ہے اور مختصر یہ کہ اُن تمام تفسیروں میں سے جو سب سے زیادہ صحیح نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ سات آسمانوں سے مُراد درحقیقت وہی ہے جو اس لفظ میں سے بظاہر سمجھ میں آتا ہے۔آسمان سے مراد ستاروں اور کواکب کا ایک مجموعہ ہے، جو اوپر کے عالم سے متعلق ہیں اور سات کا عدد وہی عدد ہے جو ایک معین تعداد کی نمائندگی کرتا ہے، کوئی کثرت اور مبالغہ مراد نہیں۔مگر قرآن کی دوسری آیات سے یہ پتا چلتا ہے کہ جو کچھ ہم نے ثابت اور سیّار ستارے اور کہکشائیں بنائی ہیں، وہ سب پہلے آسمان سے متعلق ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس عظیم مجموعے کے پیچھے، چھے (۶) مزید مجموعے ہیں، جو چھے (۶) آسمانوں کی صورت میں موجود ہیں، جو فی الحال انسان کی دسترس میں نہیں ہیں۔

سورۂ صافات میں بھی اس بات کی گواہی ملتی ہے:

---

[۱] مرحوم خواجہ نصیر الدین طوسی اپنی کتاب ''تجرید الاعتقاد'' میں نظریۂ عقولِ عشرہ پر دلائل پنجگانہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ سب نظریات غلط ہیں اور ایک مختصر سی عبارت میں کہتے ہیں "وَ اَدِلَّتُهُ وُجُودِهِ مَدْخُولَة" مزید وضاحت کے لیے خواجہ کے کلام اور اُس کی شرح میں لکھے ہوئے علامہ حلّی کے کلام کی طرف رجوع کیجیے۔

[۲] قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کی سات آیات میں سات آسمانوں کا تذکرہ ہوا ہے۔(سورۂ بقرہ، آیت ۲۹، اسراء، آیت ۴۴، مومنون، آیت ۸۶، فصلت، آیت ۱۲، طلاق، آیت ۱۲، ملک، آیت ۳، اور نوح، آیت ۱۵) اور بعض آیات میں دوسری تعبیرات کے ساتھ ان کی جانب اشارہ ہے۔

"اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ الْکَوَاکِبِ"[۱]

''ہم نے نچلے آسمان کو یا نزدیک کے آسمان کو ستاروں سے زینت بخشی۔''

یہی مطلب سورۂ فصلت کی آیت نمبر ۱۲ میں نظر آتا ہے:

"وَزَیَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ"

''ہم نے سب سے نچلے آسمان کو ستاروں کے چراغوں سے زینت بخشی۔''

اور سورۂ ملک کی پانچویں آیت:

"وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ"

لطف کی بات تو یہ ہے کہ علامہ مجلسیؒ نے بھی بحار الانوار میں اس تفسیر کو ایک فکری احتمال کی بناء پر یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ آیات اور روایات سے جو کچھ اُنہیں ملا، اُس کی بنا پر ذکر کیا ہے۔[۲]

یہ بات درست ہے کہ علمی وسائل نے اب تک ان چھے عالموں سے پردہ نہیں اُٹھایا ہے، مگر ساتھ ہی ان علمی میدانوں میں اُن عوالم کے خلاف کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔ اور شاید آئندہ اس معمے کا راز کھل جائے، بلکہ بعض دانشوروں کے مکاشفات سے یہ پتا چلتا ہے کہ اُنہیں دُور کے کچھ عالموں پر شبہ ہے۔ مثال کے طور پر بعض فضائی رسالوں میں پالومار کے رصد خانے کا بیان آیا ہے کہ 'پالومار' کے رصد خانے کی دوربین سے کئی ملین (Million) کہکشاؤں کو کشف کیا گیا ہے، جن میں سے بعض تو لاکھوں نوری سال کی مسافت کے فاصلے پر ہیں، مگر ہزاروں لاکھوں نوری برسوں کے فاصلے کے بعد ایک نہایت بڑی اور اندھیری فضا ہے جو کہ ہیبت ناک ہے اور اُس میں کوئی چیز دیکھی نہیں جا رہی۔ مگر بلا تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس ہیبت ناک اور تاریک فضا میں بھی ہزاروں لاکھوں کہکشائیں ہوں گی کہ جن کی قوت جاذبہ کی طاقت سے ہماری یہ دنیا بھی سنبھلی ہوئی ہے۔

یہ پوری عظیم دنیا جو ہماری نظر میں ہے اور اس میں ہزاروں لاکھوں کہکشائیں ہیں، یہ دنیا اپنے پورے اتنے بڑے اور ہیبت ناک وجود کے باوجود اپنے سے بڑی دنیا کے مقابل میں ایک چھوٹے ذرّے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس دوسری دنیا کے پیچھے بھی کوئی تیسری دنیا نہ ہو۔[۳] اِس بنا پر جتنے عالم انسان پر کشف ہوئے ہیں، وہ

---

[۱] سورۂ صافات، آیت نمبر ۶

[۲] بحار الانوار: ج ۵۵، ص ۷۸

[۳] مجلہ فضا، شمارہ ۵۶، فروع دین سن ۱۳۵۱ شمسی۔

سب کے سب اپنی تمام تر عظمتوں ، حیرت انگیزیوں اور رعنائیوں کے باوجود اس بڑے عالم کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے ہیں۔اور کیا معلوم کہ آئندہ انسان پر اُن چھے عالموں کی حقیقت بھی واضح ہو جائے۔

ان امور پر حضرت علیؑ کی دسترس

قابل توجہ بات یہ ہے کہ جو تعبیرات امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اس جہاں کی خلقت کے بارے میں ارشاد فرمائی ہیں، وہ ہرگز کوئی نظریہ یا فرضیہ یا احتمال نہیں ہے، بلکہ پورے یقین اور قاطعیت کے ساتھ کہی ہوئی ایسی حتمی باتیں ہیں، جو کسی حاضر و ناظر شخص کی زبان سے کہی گئی ہیں۔اور یہ اس بات کی منہ بولتی دلیل ہے کہ آپؑ علم غیب الٰہی کے خزانے سے اور تعلیماتِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستہ ہیں، جس کا سرچشمہ اور مبداء، وحی ہے اور ابن ابی الحدید کے بقول یہ سب باتیں اس حقیقت کی نشان دہی کر رہی ہیں کہ حضرت علیؑ تمام تر علوم کے مالک تھے اور یہ مطالب اُن کے فضائل و مناقب سے وابستہ ہیں۔[1] اور ایسا کیوں نہ ہو کہ ایک مقام پر آپؑ خود فرماتے ہیں:

"اَنَا بِطُرُقِ السَّمَاءِ اَعْلَمُ مِنِّی بِطُرُقِ الاَرْضِ"

''میں زمین کے راستوں سے زیادہ آسمان کے راستوں کو جانتا ہوں۔''[2]

آٹھواں حصّہ

"ثُمَّ فَتَقَ مَا بَيْنَ السَّمَوَاتِ الْعُلَا فَمَلَأَهُنَّ اَطْوَاراً مِنْ مَلَائِكَتِهِ، مِنْهُمْ سُجُوْدٌ لَا يَرْكَعُوْنَ، وَ رُكُوعٌ لَا يَنْتَصِبُوْنَ، وَ صَافُّوْنَ لَا يَتَزَايَلُوْنَ، وَ مُسَبِّحُوْنَ لَا يَسْأَمُوْنَ، لَا يَغْشَاهُمْ نَوْمُ الْعُيُوْنِ، وَلَا سَهْوُ الْعُقُوْلِ، وَلَا فَتْرَةُ الْاَبْدَانِ، وَلَا غَفْلَةُ النِّسْيَانِ، وَ مِنْهُمْ اُمَنَاءُ عَلٰى وَحْيِهِ، وَ اَلْسِنَةٌ اِلٰى رُسُلِهِ، وَ مُخْتَلِفُوْنَ بِقَضَائِهِ وَاَمْرِهِ، وَ مِنْهُمُ الْحَفَظَةُ لِعِبَادِهِ وَ السَّدَنَةُ لِاَبْوَابِ جِنَانِهِ، وَ مِنْهُمُ الثَّابِتَةُ فِي الْاَرَضِيْنَ السُّفْلٰى اَقْدَامُهُمْ، وَ الْمَارِقَةُ مِنَ السَّمَاءِ الْعُلْيَا اَعْنَاقُهُمْ، وَ الْخَارِجَةُ مِنَ الْاَقْطَارِ اَرْكَانُهُمْ، وَالْمُنَاسِبَةُ لِقَوَائِمِ الْعَرْشِ اَكْتَافُهُمْ نَاكِسَةٌ دُوْنَهُ اَبْصَارُهُمْ مُتَلَفِّعُوْنَ تَحْتَهُ بِاَجْنِحَتِهِمْ، مَضْرُوْبَةٌ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَنْ دُوْنَهُمْ حُجُبُ الْعِزَّةِ وَ اَسْتَارُ الْقُدْرَةِ، لَا يَتَوَهَّمُوْنَ رَبَّهُمْ

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۱، صفحہ ۸۰

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۹

بِالتَّصْوِيرِ، وَلَا يُجْرُوْنَ عَلَيْهِ صِفَاتِ الْمَصْنُوْعِيْنَ، وَلَا يَحُدُّوْنَهُ بِالْاَمَاكِنِ، وَلَا يُشِيْرُوْنَ اِلَيْهِ بِالنَّظَائِرِ"

پھر اُس نے بلند ترین آسمانوں کے درمیان شگاف پیدا کیے اور انہیں طرح طرح کے فرشتوں سے بھر دیا، جن میں سے بعض سجدے میں ہیں تو رکوع کی نوبت نہیں آتی ہے اور بعض رکوع میں ہیں تو سر نہیں اٹھاتے ہیں اور بعض صف باندھے ہوئے ہیں تو اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتے ہیں، بعض مشغول تسبیح ہیں تو خستہ حال نہیں ہوتے ہیں، یہ سب کے سب وہ ہیں کہ ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور نہ عقلوں پر سہو و نسیان کا۔ نہ بدن میں سستی پیدا ہوتی ہے اور نہ دماغ میں نسیان کی غفلت۔ ان میں سے بعض کو وحی کا امین اور رسولوں کی طرف قدرت کی زبان بنایا گیا ہے۔ جو اس کے فیصلوں اور احکام کو برابر لاتے رہتے ہیں اور کچھ اس کے بندوں کے محافظ اور جنت کے دروازوں کے دربان ہیں اور بعض وہ بھی ہیں جن کے قدم زمین کے آخری طبقے میں ثابت ہیں اور گردنیں بلند ترین آسمانوں سے بھی باہر نکلی ہوئی ہیں۔ ان کے اطرافِ بدن اقطارِ عالم سے وسیع تر ہیں اور ان کے کاندھے عرش کے ستونوں کو اٹھانے کے قابل ہیں۔ ان کی نگاہیں عرش الٰہی کے سامنے جھکی ہوئی ہیں اور وہ اس کے نیچے پروں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کے اور دیگر مخلوقات کے درمیان عزت کے حجاب اور قدرت کے پردے حائل ہیں۔ وہ اپنے پروردگار کے بارے میں شکل وصورت کا تصور بھی نہیں کرتے ہیں اور نہ اس کے حق میں مخلوقات کی صفات کو جاری کرتے ہیں، وہ نہ اسے مکان میں محدود کرتے ہیں اور نہ اس کی طرف امثال ونظائر سے اشارہ کرتے ہیں۔ [1]

شرح وتفسیر

فرشتوں کا عالم

اس خطبے کے شروع میں حضرت علی علیہ السلام نے آسمانوں کی تخلیق اور مخلوقات کی طرز خلق کا ذکر کیا اور اب فرشتوں کے عالم بالا میں رہنے، ان کی خصوصیات، اقسام اور عمل کا طریقہ کار اور ان کے وجود کی عظمت، ان کی معرفت کا بلند معیار ہونا وغیرہ بیان فرمایا ہے۔

"ثُمَّ فَتَقَ مَا بَيْنَ السَّمٰوَاتِ الْعُلَا [2]"

---

[1] وضاحت، کتاب کے آخر "ضمیمہ" میں ملاحظہ فرمائیں۔

[2] العلاء، علیا کی جمع ہے اور اس کی مونث "اعلیٰ" ہے یعنی بالا اور اشرف کے معنی میں ہے۔

اس تعبیر سے ہم اچھی طرح استفادہ کرسکتے ہیں کہ آسمانوں کے درمیان فاصلے موجود ہیں اور وہ شروع سے ایک دوسرے میں بھی مربوط اور پیوست تھے اور پھر ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ یہ حقیقت نظریۂ بطلیموس کے خلاف ہے کہ یہ طبقات پیاز کے چھلکوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، اور ان کے بیچ میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت امام علیؑ فرماتے ہیں:

"فَمَلَاَهُنَّ اَطْوَارًا [۱] مِنْ مَلَآئِكَتِهٖ، [۲]

خداوند عالم نے ان فاصلوں کوفرشتوں کے وجود سے پُر کیا ہے۔

خطبۂ اشباح (خطبہ نمبر ۹۱) میں ہم پڑھتے ہیں:

"وَمَلَاَ بِهِمْ فُرُوْجَ فِجَاجِهَا وَحَشَا بِهِمْ فُتُوْقَ اَجْوَائِهَا"

یعنی فرشتوں کے ذریعے سے آسمانوں کے فاصلوں کو پُر کیا اور اُن کی فضا کے فاصلوں کو فرشتوں سے مالا مال کیا۔

اسی خطبے کے دوسرے جملے میں ہم پڑھتے ہیں:

"وَلَيْسَ فِيْ اَطْبَاقِ السَّمَاءِ مَوْضِعُ اِهَابٍ اِلَّا وَعَلَيْهِ مَلَكٌ سَاجِدٌ اَوْ سَاعٍ حَافِدٌ"

''تمام آسمانوں میں اتنی جگہ نہیں جتنی چوپایوں کی کھال کے درمیان، مگر یہ کہ وہاں کوئی فرشتہ سجدہ کرتا ہوا ہوگا یا تیزی سے اپنے کام میں مشغول ہوگا۔''

یہاں پر فرشتوں کو چار گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے، سب سے پہلے وہ فرشتے جن کا کام عبادت کرنا ہے اور ان کے بھی چند گروہ ہیں:۔

"مِنْهُمْ سُجُوْدٌ [۳] لَا يَرْكَعُوْنَ"

'' ایک گروہ وہ ہے جو صرف سجدہ کرتا ہے، رکوع نہیں کرتا۔''

"وَرُكُوْعٌ لَا يَنْتَصِبُوْنَ"

''ایک گروہ ہے جو رکوع کرتا ہے قیام نہیں کرتا۔''

---

[۱] اطوار، طور کی جمع ہے، قول کے وزن پر یہ صنف کے معنی میں، نیز حد، مقدار اور حالت و کیفیت کے معنی میں بھی آیا ہے۔

[۲] اگرچہ عبارت کا ظاہر یہ ہے کہ ''ھن'' کی ضمیر آسمانوں کی طرف پلٹتی ہے لیکن ''ثم فتق'' کے قرینے کے ذریعے اور فملاھن میں موجود فاء تفریع سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہاں مراد آسمانوں کے درمیان موجود فاصلے ہیں۔

[۳] سجود ''ساجد'' کی جمع ہے (سجدہ کرنے والا)۔ جس طرح رکوع ''راکع'' کی جمع ہے (یعنی رکوع کرنے والا)

"وَ صَافُّوْنَ [۱] لَا یَتَزَایَلُوْنَ"

''ایک گروہ وہ ہے جو صرف قیام کرتا ہے اور اس حالت سے جدا نہیں ہوتا۔''

بعض نے لفظ ''صافون'' کو صف باندھنے والوں کے معنی میں استعمال کیا ہے اور بعض نے ان کے بال و پر کو آسمان تک پھیل جانے کا معنی لیا ہے، اس بات پر قرینہ، وہ تعبیر ہے جو کہ قرآن میں پرندوں کے لیے آئی ہے:

"اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ"

''کیا وہ نہیں دیکھا ہے کہ ان کے سروں پر پرندے پر پھیلائے ہوئے ہیں۔''

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ منظم صفوں سے مراد خداوند متعال کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ [۲] پہلا احتمال زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہماری عبادت کی تین مخصوص حالتیں: ۔ قیام، رکوع اور سجود ہیں، ان فرشتوں میں بھی ہر گروہ ان تین میں سے کسی ایک عبادت میں غرق ہے۔

صافون سے مراد یا تو فرشتوں کی منظم صفیں ہیں یا ان میں سے ہر ایک کا منظم قیام ہے۔ بالکل اُسی طرح، جس طرح خطبۂ ھمام میں متقین کے بارے میں آیا ہے:

"اَمَّا اللَّیْلَ فَصَافُّوْنَ اَقْدَامَهُمْ تَالِیْنَ لِاَجْزَاءِ الْقُرْآنِ" [۳]

راتوں میں اپنے پیروں پر کھڑے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔

"وَ مُسَبِّحُوْنَ لَا یَسْأَمُوْنَ"

''اور دوسرا گروہ تسبیح خدا میں مصروف ہے، ہرگز تھکتا نہیں۔''

اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گروہ مذکورہ تین گروہوں کے علاوہ ایک اور گروہ ہے۔ نہج البلاغہ کے بعض مفسّروں نے احتمال دیا ہے کہ تسبیح کرنے والے وہی پہلے تینوں گروہ ہیں۔ اور بعض روایات سے اس کلام کی تائید کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ فرشتوں کی نماز کیسے ہوتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب نہیں دیا، اتنے میں جبرئیل امینؑ نازل ہوئے اور آپؐ سے فرمانے لگے:

"أَنَّ اَهْلَ السَّمَاءِ الدُّنْیَا سُجُوْدٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ یَقُوْلُوْنَ سُبْحَانَ ذِی الْمُلْكِ وَ الْمَلَكُوْتِ وَ

---

[۱] ''صافون'' جمع ہے ''صاف'' کی (بروزنِ حاد) اس کا مادّہ ''صف'' ہے، اور مساوات کا معنیٰ دیتا ہے، اس کو اس کے اصلی مادّے ''صفصف'' سے لیا گیا ہے جو صاف زمین کے معنیٰ میں آتا ہے۔

[۲] سورۂ ملک، آیت ۱۹

[۳] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۳

اَهْلُ السَّمَاءِ الثَّانِيَةِ رُكُوعٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ يَقُوْلُوْنَ سُبْحَانَ ذِى الْعِزَّةِ وَ الْجَبَرُوْتِ وَ اَهْلُ السَّمَاءِ الثَّالِثَةِ قِيَامٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ يَقُوْلُوْنَ سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِىْ لَا يَمُوْتُ"۔[۱]

''پہلے آسمان کے فرشتے قیامت تک سجدہ ریز رہیں اوران کا ورد یہ ہے اور کہتے ہیں'' پاک ہے جو صاحبِ ملک وملکوت ہے'' اور دوسرے آسمان کے فرشتے قیامت تک رکوع میں ہیں اور کہتے ہیں۔'' پاک ہے جو صاحبِ عزت و جبروت ہے'' اور تیسرے آسمان کے فرشتے قیامت تک حالت قیام میں ہیں اور کہتے ہیں۔'' پاک ہے جو زندہ ہے اور اُسے موت نہیں۔''

کیا اس مقام پر سجدہ، رکوع اور قیام سے مراد وہی سجدہ و قیام و رکوع ہے جو ہم انجام دیتے ہیں یا فرشتوں کے خضوع اور عبادت کی طرف اشارہ ہے، جو ان کے مقام و مرتبہ کے حساب سے ہے۔ اگر اُن کے لیے جسم لطیف مانیں اور کہیں کہ ان کے ہاتھ، پاؤں اور شکل ہے، تو پہلا معنی زیادہ مناسب ہے اور اگر اُن کا جسم نہ مانیں یا ان کے لیے جسم ہمارے جسم کی طرح نہ مانا جائے، تب دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔

بہر حال اُن کا کام اللہ کی عبادات و تسبیح و تقدیس کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان فرشتوں کا وجود اللہ کی عظمت کا مظہر ہے دوسرے لفظوں میں ان کی خلقت کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان اپنی عبادتوں پر مغرور نہ ہو اور اگر وہ عبادت کا محتاج ہوتا (نعوذ باللہ) تو عالم بالا کے فرشتے جو ہر جگہ عبادت میں مشغول ہیں، اُس کی عبادت کے لیے کافی تھے، لہٰذا زمین پر بسنے والے بندگان خدا یہ خیال نہ کریں کہ ان کی عبادت کرنے یا نہ کرنے سے خدا کی بزرگی و کبریائی پر کوئی فرق پڑتا ہے، کیوں کہ اگر ان سب کو کافر قرار دے دیا جائے، تب بھی خدا کی کبریائی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنْكُمْ"۔[۲]

''اگر تم نے اس کا انکار کرو گے تو (یاد رکھو کہ) خدا تم سے بالکل بے پروا ہے۔''

ان فرشتوں کے اوصاف کے بارے میں مزید فرمایا:

"لَا يَغْشَاهُمْ نَوْمُ الْعُيُوْنِ وَلَا سَهْوُ الْعُقُوْلِ وَلَا فَتْرَةُ الْاَبْدَانِ وَلَا غَفْلَةُ النِّسْيَانِ"

''نہ آنکھوں کی نیند انہیں چھپا سکتی ہے، نہ عقل کی خطا انہیں گرفتار کر سکتی ہے نہ بدن کی سستی اور نہ نسیان کی غفلت ان پر عارض ہو سکتی ہے۔''

---

[۱] بحار الانوار، جلد ۵۹، صفحہ ۱۹۸

[۲] سورۂ زمر، آیت ۷

اس کے برعکس انسان کی عبادتوں کا یہ سلسلہ جب تکرار ہوتا ہے؛ تو وہ آہستہ آہستہ ان کیفیات کا شکار ہو جاتا ہے؛ نیند کا خمار اسے گھیر لیتا ہے؛ بدن سست ہو جاتا ہے؛ سہو ونسیان عارض ہو جاتا ہے، لیکن عبادت کرنے والے ملائکہ ان حالات سے دوچار نہیں ہوتے۔ یہ فرشتے اس طرح عبادات ومناجات اور تسبیح میں غرق ہیں کہ ہرگز نیند یا کوئی کمزوری انہیں چھو نہیں سکتی۔ دوسرے معنوں میں یہ کیفیات امورِ شرعی والٰہی کی انجام دہی میں کوتاہی کا سرچشمہ بنتی ہیں جو کہ ان فرشتوں کے اندر نہیں ہیں۔ گویا کبھی اس کوتاہی کا منشا تھکاوٹ ہے، کبھی آنکھوں میں نیند، کبھی سستی اور کبھی غفلت ونسیان۔ اور یہ سب ان فرشتوں میں نہیں ہے۔ یعنی عبادت پروردگار کرتے ہوئے ان کے بدن میں کبھی سستی پیدا نہیں ہوتی۔

اس کے بعد فرشتوں کے دوسرے گروہ کا ذکر فرمایا:

"وَمِنْهُمْ اُمَنَاءُ عَلٰى وَحْيِهٖ وَاَلْسِنَةٌ اِلٰى رُسُلِهٖ وَمُخْتَلِفُوْنَ بِقَضَائِهٖ وَاَمْرِهٖ"

''ان میں سے بعض امین وحی اور پیغمبروں سے گفتگو کرنے والے ہیں اور حکمِ خدا کو پہنچاتے ہیں''۔

درحقیقت یہ فرشتے پروردگار اور اس کے پیغمبروں کے درمیان واسطہ اور وحی الٰہی کے ترجمان ہیں، اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ صرف جبرئیل علیہ السلام ہی سفیرِ وحی نہیں ہیں، بلکہ وہ اللہ کے سفیروں کے رئیس وسردار ہیں۔ قرآن مجید کی آیات میں فرشتوں کے اس گروہ کی طرف اشارہ ملتا ہے:

"قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ" [1]

''کہو کہ اس قرآن کو روح القدس نے اپنے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا ہے۔''

ایک دوسری جگہ فرمایا:

"قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ" [2]

''کہو کہ جو بھی جبرائیلؑ کا دشمن ہے (وہ درحقیقت خدا کا دشمن ہے کیوں کہ) اس نے اللہ کے حکم سے قرآن کو تمہارے دل پر نازل کیا ہے۔''

کبھی حاملانِ وحی کی طرف اشارہ ہوتا ہے:

"يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ" [3]

---

[1] سورۂ نحل: آیت ۱۰۲

[2] سورۂ بقرہ: آیت ۹۷

[3] ۳۔ سورۂ نحل: آیت ۲

''وہی اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس کے پاس چاہتا ہے وحی دے کر فرشتوں کو بھیجتا ہے۔''

روایات اور نہج البلاغہ کے بعض خطبوں میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے، متوجہ رہیں کہ اس مقام پر قضا اور امرِ الٰہی سے مراد فرمان و دستور الٰہی و شریعت ہے، فرمانِ تکوینی مراد نہیں، جس کا بعض مفسرین نہج البلاغہ نے احتمال دیا ہے، کیوں کہ یہ بات سابق الذکر جملوں، جہاں فرشتوں کو وحی الٰہی کا امین ٹھہرایا گیا ہے سے مناسبت نہیں رکھتی اور مولاؑ کے کلام میں ''مُخْتَلِفُوْنَ'' جو مادّۂ اختلاف سے ہے، کا مطلب رفت و آمد ہے۔ اس کے بعد فرشتوں کے تیسرے گروہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے:

''وَمِنْهُمُ الْحَفَظَةُ لِعِبَادِهٖ وَالسَّدَنَةُ لِاَبْوَابِ جِنَانِهٖ''[۱]

''ان میں سے بعض بندگان خدا کے محافظ اور بہشت کے دربان ہیں۔''

''حَفَظَةُ'' جمع حافظ، نگہبان کے معنی میں آیا ہے، یہاں دو معنی لیے جاسکتے ہیں، ایک یہ کہ بندوں کے محافظ اور ان کے اعمال کے نگران کہ جو اعمال کو لکھتے ہیں جیسا کہ سورۂ طارق میں اشاد ہوتا ہے:

''اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ''[۲]

''ہر نفس کے اوپر ایک نگہبان مقرر ہے۔''

اور سورۂ انفطار میں ارشاد ہے:

''وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ''[۳]

''تمہارے اوپر نگہبان مقرر ہیں کہ جو تمہارے اعمال کو مسلسل لکھتے ہیں۔''

دوسرے وہ نگہبان ہیں جو بندگان خدا کو آفات و بلیات اور مختلف حادثاتِ دنیاوی سے محفوظ رکھتے ہیں، اگر یہ نہ ہوتے تو بربادی ہمیشہ اُنہیں گھیرے رہتی۔ اس لیے سورۂ رعد میں ارشاد ہے:

''لَهٗ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ''[۴]

''انسان کے لیے کچھ نگہبان مقرر ہیں جو کہ ان کے آگے پیچھے اللہ کے حکم سے حفاظت کرتے ہیں۔''

لیکن پہلا معنی اپنے سابقہ معنوں کے ساتھ جو وحی اور شرعی تکالیف کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس کے بعد کا جملہ جو

---

[۱] سدنۃ، سادن کی جمع ہے خدمت گزار اور دربان کے معنی میں ہے۔

[۲] سورۂ طارق، آیت ۴

[۳] سورۂ انفطار، آیات ۱۰، ۱۱

[۴] سورۂ رعد، آیت ۱۱

بہشت اور اعمال کی جزا کی طرف اشارہ ہے، زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور بہر حال دونوں معنی عبادت کے مفہوم سے دور نہیں ہیں۔ سَدَنَۃٌ ، سَادِنٌ کی جمع ہے ، جس کے معنی دربان کے ہیں اور جِنَانٌ بروزن کتاب ، جنت یعنی بہشت، کی جمع ہے۔ اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کئی بہشتیں بنائی ہیں۔

نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے آٹھ جنتوں کا تذکرہ کیا ہے، جن کے نام قرآن مجید میں آئے ہیں:

"جَنَّةُ النَّعِيْمِ وَ جَنَّةُ الْفِرْدَوْسِ وَ جَنَّةُ الْخُلْدِ و جَنَّةُ الْمَأْوٰى وَ جَنَّةُ عَدْنٍ وَ دَارُ السَّلَامِ وَ دَارُ الْقَرَارِ وَ جَنَّةٌ عَرْضُهَا السَّمٰوَاتُ وَ الْاَرْضُ"[1]

اعمال ثبت کرنے والے فرشتوں کا کیا فائدہ؟

ان کا فائدہ یہ ہے کہ انسان اپنی ذمّے داری کا احساس کرے اور اپنے اعمال و کردار میں ہوشیار رہے، کیونکہ ان کا ہدف تربیت انسان اور اسے برے اعمال و انحرافات سے روکنا ہے۔ فرشتوں کے چوتھے گروہ، جو کہ حاملانِ عرشِ الٰہی کہلاتے ہیں، کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

"وَمِنْهُمُ الثَّابِتَةُ فِي الْاَرَضِيْنَ السُّفْلٰى اَقْدَامُهُمْ وَ الْمَارِقَةُ مِنَ السَّمَاءِ الْعُلْيَا اَعْنَاقُهُمْ وَ الْخَارِجَةُ مِنَ الْاَقْطَارِ اَرْكَانُهُمْ وَالْمُنَاسِبَةُ لِقَوَائِمِ الْعَرْشِ اَكْتَافُهُمْ"

''ان کے پاؤں زمین پر ہیں، ان کی گردنیں آسمان بالا میں ہیں، ان کے جسم کے اعضا و جوارح اس کرّۂ ارض سے باہر ہیں اور ان کے کندھے عرشِ خدا کو قائم رکھنے کے لیے ہیں۔''

ان اوصاف کے بیان میں مزید ارشاد ہوتا ہے:

"نَاكِسَةٌ[2] دُوْنَهُ اَبْصَارُهُمْ مُتَلَفِّعُوْنَ[3] تَحْتَهُ بِاَجْنِحَتِهِمْ مَضْرُوْبَةٌ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَنْ دُوْنَهُمْ حُجُبُ الْعِزَّةِ وَ اَسْتَارُ الْقُدْرَةِ"

ان کی آنکھیں عرش کے آگے جھکی ہوئی ہیں اور انھوں نے اپنے بالوں میں خود کو چھپایا ہوا ہے۔ انھیں اور ان سے

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن میثم، جلد اوّل ص ۱۵۸، اور شرح نہج البلاغہ مرحوم میرزا حبیب اللہ خوئی، ج ۲، ص ۲۶۔

[2] "ناکسہ" "نکس" کے مادّے سے ہے (بروزن عکس) یعنی زیر و زبر کرنا۔ اسی لیے پیروں سے پیدا ہونے والے بچے کو "منکوس" اور تیر بنانے کے لیے تراشی جانے والی لکڑی کے نوک دار سرے کو "نُکس" کہتے ہیں۔

[3] متلفعون "لفع" کے مادّہ سے ہے (بروزن نفع) جو کسی چیز کو شامل ہونے اور لپیٹنے کو کہتے ہیں، اسی لیے عورت جب اپنی چادر لپیٹتی ہے تو اسے "تلفعت المرئۃ" کہا جاتا ہے۔

مرتبے میں کم فرشتوں پر عزت اور قدرت کے حجاب پڑے ہوئے ہیں۔ مزید تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لَا يَتَوَهَّمُوْنَ رَبَّهُمْ بِالتَّصْوِيْرِ، وَلَا يُجْرُوْنَ عَلَيْهِ صِفَاتِ الْمَصْنُوْعِيْنَ وَلَا يَحُدُّوْنَهُ بِالْأَمَاكِنِ وَلَا يُشِيْرُوْنَ إِلَيْهِ بِالنَّظَائِرِ"[1]

ان کی معرفت اتنی ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی تصویر ہرگز نہیں بناتے، مخلوق کی صفات کو اس پر جاری نہیں کرتے، اسے کسی مکان میں محدود نہیں کرتے اور نہ مثالوں سے اشارہ کرتے ہیں، بلکہ ان کی روحانی قدرت، فوق العادہ ہے کہ کوئی بھی اس مقام کو حاصل نہیں کرسکتا ہے۔ بس اسی دلیل کی بنیاد پر حاملانِ عرشِ الٰہی کے اہل قرار پائے ہیں۔ درحقیقت انہوں نے توحید کے بلندترین مقام کو سمجھا ہے جو کہ تمام بندگانِ الٰہی بالخصوص بلند پایہ انسانوں کے لیے شائستہ ہے۔ وہ کسی بھی طریقے سے خدا کی شبیہ اور مثال کے قائل نہیں ہیں اور نہ ہی اُس کی ذات وصفات میں محدودیت کے قائل ہیں، اسے اپنے وہم وگمان سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ چونکہ جو بھی انسان یا فرشتے کے خیال میں آئے، وہ مخلوق ہے اور خدا مخلوق سے بالاتر ہے۔ عرش کیا ہے؟ حاملانِ عرشِ الٰہی کون ہیں؟ اور اس جملے میں ذکر شدہ عظمت سے کیا مراد ہے، وغیرہ، آئندہ نکات سے متعلق موضوع میں بیان ہوں گے۔

نکات

فرشتے کیسے ہوتے ہیں؟

قرآن مجید کی آیات میں فرشتوں کے اوصاف، خصوصیات، اعمال و افعال اور ان کی مختلف ذمے داریوں کے بارے میں بہت کچھ آیا ہے، اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن سکتی ہے۔ روایات میں بھی فرشتوں کے اوصاف، اعمال اور مقامات کے بارے میں بہت کچھ ملتا ہے، لیکن کہیں بھی ان کی ماہیت سے متعلق نہیں ملتا۔ چنانچہ اس دلیل کی بنا پر ان کی ماہیت کے متعلق دانشوروں میں بحث ومباحثہ پایا جاتا ہے۔ علمِ کلام کے اکثر علماء نے انہیں لطیف جسم سے تعبیر کیا۔ بعض تعبیرات میں فرشتوں کے لیے کلمۂ نور استعمال ہوا ہے، جس سے ان کے اصل مادّے کی تشکیل مراد لی گئی ہے:

"اَلْمَلَكُ جِسْمٌ نُوْرِيٌّ"[2]

---

[1] "نظائر" "نظیر" کی جمع ہے، یعنی مثال۔

[2] بحار الانوار ج ۵۶، ص ۲۰۲ (باب حقیقتِ ملائکہؑ)۔

''فرشتہ ایک نوری جسم ہے۔''

علامہ مجلسیؒ نے یوں بیان کیا ہے کہ امامیہ اور دیگر مسلمان، سوائے چند فلسفیوں کے، فرشتوں کے بارے میں اجسامِ لطیفہ نوری کے قائل ہیں اور یہ کہ وہ مختلف شکلوں میں آسکتے ہیں البتہ نبی اور اوصیا کو وہ دکھائی دیتے تھے۔ ایک دوسری تعبیر کے مطابق فرشتے جسمِ نوری جبکہ جنّ جسمِ ناری اور انسان کا جسم عناصرِ اربعہ سے مرکب ہے۔ ایک دوسرا قول جو تمام فلاسفہ سے مربوط ہے کہ ملائکہ جسم وجسمانیات سے خالی ہوتے ہیں۔ مرحوم خوئی شارح نہج البلاغہ (منہاج البراعہ) نے چھے اقوال اس سلسلے میں نقل کیے ہیں، جن کے قائل افراد بہت کم ہیں۔ بے شک قرآن نے فرشتوں کے (اعمال واوصاف، خصوصیات) وجود کو بیان کیا ہے۔ جو غیبی امور میں سے ہیں اور ان صفات، خصوصیات کو بغیر دلیلِ نقلی کے ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید نے ان کے لیے یہ خصوصیات بیان کی ہیں:

۱- یہ کہ عاقل اور باشعور ہیں۔

۲- مکمل طور پر خدا کے فرماں بردار ہیں اور کسی صورت میں خدا کی معصیت نہیں کرتے ہیں۔

۳- اللہ کے حکم سے اہم ذمّے داری اور مختلف قسم کے اعمال انجام دیتے ہیں۔ (یعنی بعض حاملانِ عرش ہیں، بعض مدبراتِ امر ہیں۔ بعض روح قبض کرتے ہیں، بعض بشر کے اعمال کا حساب کتاب کرتے ہیں، بعض انسانوں کو خطرات سے بچاتے ہیں، بعض جنگوں میں مومنین کی امداد کرتے ہیں، بعض سرکشوں اور تجاوز کرنے والوں پر عذاب نازل کرتے ہیں، بعض وحی الٰہی کو انبیاؑ تک پہنچاتے ہیں)

۴- تمام فرشتے ایک سطح کے نہیں بلکہ ان کے مختلف درجات اور حیثیتیں ہیں۔

۵- تسبیح اور حمدِ الٰہی مسلسل انجام دیتے ہیں۔

۶- کبھی انسان کی صورت میں یا دوسری صورتوں میں انبیا علیہم السلام اور کچھ منتخب انسانوں پر ظاہر ہوتے ہیں، جیسے حضرت مریمؑ پر فرشتہ ظاہر ہوا، اور دیگر اوصاف جن کی تفصیل اس مختصر بحث میں نہیں سما سکتی۔ اگرچہ یہ بحث کہ فرشتے جسم رکھتے ہیں یا نہیں، اس کا کوئی اثر نہیں ہے، کیوں کہ آیات وروایات کا ظاہر تفسیر کے بغیر سمجھ میں آتا ہے کہ یہ فرشتے مادّی نہیں ہوتے اور جسم وجسمانیت سے مبرّا بھی نہیں ہیں، کیوں کہ جسم وجسمانیت کے لیے زمان ومکان لازمی جز ہے جو آیات وروایات میں ان کے لیے بیان ہوا ہے۔

خطبۂ اشباح میں اور مولا علی علیہ السلام کے دیگر کلام میں بعض تعبیرات کی تائید ہوتی ہے اور قرآن کے مطابق ملائکہؑ پر اجمالی طور پر اعتقاد رکھنا اسلامی تعلیمات کا حصّہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ"

"(ہمارے) پیغمبر (محمدؐ) جو کچھ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لائے اور ان کے (ساتھ) مومنین بھی۔ (سب کے) سب خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔"[1]

یہ نکتہ قابل غور ہے کہ بعض نااہل افراد نے غیبی عوالم کے منکرین کو شاد کرنے کے لیے یہ نظریہ اپنایا ہے کہ فرشتے بھی انسانی خواص رکھتے ہیں، جبکہ آیات قرآنی کے اجمالی مطالعے کی رُو سے اس طرزِ فکر کی مکمل طور پر نفی ہوتی ہے، کیوں کہ فرشتوں کے لیے عقل وشعور، ایمان واخلاص اور عصمت ثابت ہے۔

اقسام واوصافِ ملائکہؑ

ملائکہؑ کی مختلف اقسام ہیں، جن کے متعلق آیات وروایات میں اشارہ ہوا ہے۔ البتہ چار مشہور گروہ وہ ہیں، جن کے بارے میں مولا علیؑ کے خطبے میں ذکر آیا ہے (پروردگار کی عبادت کرنے والے، لوگوں کے اعمال کا حساب رکھنے والے، اللہ کی طرف سے پیغمبروں کی طرف بھیجے جانے والے اور حاملانِ عرش) جبکہ ہم کہہ چکے کہ آیات قرآنی میں دیگر اقسام کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے، ان میں سے سرکش وظالموں پر مقرر فرشتے، مومنین کی امداد کرنے والے، انسانوں کی روح قبض کرنے والے اور مدبّراتِ امر یعنی اس دنیا کے معاملات چلانے والے اگرچہ ان سب کو مدبرات امر کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ وہ اپنی قدرت وعظمت اور مقاصد کی نشاندہی، اور اس دنیا کے امور ان فرشتوں کے وسیلے سے انجام دیتا ہے جو اس کے حکم کے سامنے بغیر کسی سستی، کمزوری، سہو ونسیان اور کجی کے سرِ تسلیم خم ہیں۔ ان گروہوں میں سے ہر ایک منظم اور معیّن نظام کے تحت گامزن ہے۔

چنانچہ کبھی کبھی انسان فرشتوں کے مختلف گروہوں کی سرگرمی اور منظم امور سے اپنے اندر احساس کمتری محسوس کرتا ہے کہ اس وسیع دنیا اور حق کے لیے کام کرنے والے خدائی لشکر اور اللہ کے فرماں بردار بندوں میں یہ کیا حیثیت رکھتا ہے اور کس کام کا ہے؟ اگر اطاعت وعبادت وہ ہے جو فرشتے انجام دیتے ہیں تو میری عبادت کیا ہے؟ اگر قدرت وتوانائی وہ ہے جو ان کے پاس ہے تو میری قدرت کی کیا حیثیت ہے؟ مختصر یہ کہ فرشتوں کے وجود کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان اس کائنات اور اس کے خالق کی عظمت اور اپنی بے بسی اور حرکات سے آشنا ہوتا ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۵

عرش وحاملانِ عرشِ الٰہی

قرآن مجید کی آیات میں تقریباً بیس مرتبہ عرشِ الٰہی کی طرف اشارہ ہوا ہے اور روایات میں اس سے متعلق بہت زیادہ ابحاث موجود ہیں۔ بعض روایات کے مطابق عرشِ خدا کی عظمت اس قدر ہے کہ انسان کے تصور میں نہیں آسکتی۔ زمینوں، آسمانوں اور ان کے اندر جو کچھ ہے وہ سب عرش کی عظمت کے مقابلے میں ایک وسیع صحرا میں حلقۂ انگشتری کے برابر ہے۔ اسی طرح بعض روایات میں آیا ہے کہ سب سے زیادہ بڑے فرشتے اگر قیامت تک تیز رفتاری سے پرواز کریں، تب بھی عرش تک نہیں پہنچ سکتے۔ نیز وارد ہوا ہے کہ خدا نے عرش کے لیے ہزار زبان اور تمام مخلوقات کی صورتیں خواہ وہ دریا میں ہوں یا صحرا میں پیدا کی ہیں۔

یہ بھی آیا ہے کہ جب عرش کو پیدا کیا گیا تو خدا نے فرشتوں کو دستور دیا کہ اسے اٹھائیں تو وہ اسے نہ اٹھا سکے، پھر زیادہ سے زیادہ فرشتے پیدا کیے مگر وہ بھی نہیں اٹھا سکے، تب خدا نے اپنی قدرت سے اس کی حفاظت کی۔ اور جب فرشتے اس کے اٹھانے پر مامور ہوئے تو ان سے اللہ نے کہا، اسے اٹھاؤ، انہوں نے کہا کہ جو کام سارے فرشتے مل کر نہ کر سکے ہم کیسے کر سکتے ہیں! تو اس مقام پر دستور دیا گیا کہ خدا کے نام اور ذکر "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" اور محمد و آلِ محمد علیہم السلام پر درود سے مدد لو، انہوں نے ایسا ہی کیا تو عرشِ الٰہی کو اٹھانا آسان ہوا۔ [1]

یہ تمام اشارات و کنایات خدا کے عرش کی عظمت کو بیان کرتے ہیں، مگر یہ عرش کیا ہے، دانشمندوں میں زیرِ بحث ہے۔ اور وضاحت کے ساتھ اس بحث میں داخل ہونا ہمیں اصل مقصد سے دور کر دے گا، اس لیے یہاں مختصر گفتگو پر اکتفا کرتے ہیں۔ بادشاہوں اور سلاطین کے دو قسم کے تخت ہوتے ہیں، ایک چھوٹا تخت ہوتا ہے جو عام دنوں میں بیٹھنے کے لیے اور حکومت کے معاملات کو چلانے کے لیے ہوتا ہے اور دوسرا اونچا ہوتا ہے جو خاص دنوں اور عمومی ملاقاتوں اور بڑے پروگراموں کے لیے ہوتا ہے۔ عربی ادب میں پہلے تخت کو کرسی اور دوسرے کو عرش کہتے ہیں۔ اکثر اوقات عرش سے قدرت اور مکمل تسلط مراد لی جاتی ہے، جیسا کہ معلوم ہے کہ عرش کے پائے نہیں ہیں، مگر معروف جملہ ہے "تَلَّ عَرْشُهُ"، یعنی عرش گر پڑا تو اس سے مراد قدرت و طاقت کا ہاتھ سے کھو بیٹھنا ہے اور یہ کنایہ ہے۔

خداوند عالم، کائنات کا حاکم ہے، یعنی اس کائنات کا حاکم مطلق ہے، جس کے پاس تخت کی ان دو قسموں یعنی

---

[1] منہاج البراعۃ فی شرح نہج البلاغہ ج ۲، ص ۳۲ تا ۳۵۔ مرحوم علامہ مجلسیؒ نے عرش و کرسی سے متعلق روایات کو بحار الانوار کی جلد ۵۵ میں تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور درج بالا روایات کا اسی جلد کے صفحہ ۵، ۱۷ اور ۵۵ پر ذکر ہے۔

حکومت اور شہنشاہیت (کنائی مفہوم کے طور پر عرش و کرسی) ہے۔عرش اور حکومتِ الٰہی کا تخت کیا ہے؟اس سلسلے میں جو تفسیریں بیان ہوئی ہیں،من جملہ یہ کہ عالم مادّہ کا مجموعہ،آسمان و زمین، ستارے، نظامِ شمسی یہ سب گویا کرسی اور چھوٹا تخت ہیں،اس لیے قرآن فرماتا ہے:

"وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ"

''اُس کی کرسی زمین وآسمانوں کو گھیرے ہوئے ہے۔''

عرش کا مطلب وہ عالم جو مادّے سے ماورا ہے، جو صرف عالمِ بالا پر محیط ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ پوری مادّی دنیا اس کے مقابل بہت چھوٹی اور کم اہمیت ہے۔البتہ حاملانِ عرش کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسے فرشتے ہیں جو خوفناک ہیکل اور لمبا چوڑا جسم رکھتے ہیں اور ایک بلند تخت کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں اور خداوند عالم اس کے اوپر (نعوذ باللہ) ٹیک لگائے بیٹھا ہے کیوں کہ یہ بیان ہو چکا کہ یہ مقامِ کنایہ ہے اور قرائن عقلی سے ثابت ہے کہ اللہ جسم وجسمانیت سے مبرّا ہے۔

اس بنا پر حاملانِ عرش، بلند و بالا مقام کے حامل فرشتے ہیں اور ان کی مانند کوئی نہیں اور وہ طبیعت سے بالاتر اس کائنات کے امور کو چلاتے ہیں اور اس کے فرمان کا ہر جگہ نفاذ کرتے ہیں اور آپ نے دیکھا کہ مولائے کائناتؑ کی عبارت میں ان کی عظمت و بزرگی اس طرح بیان ہوئی ہے کہ ان کی گردنیں آسمانوں میں، ان کے پاؤں زمین کے نچلے طبقات میں ان کے اعضاء و جوارح اس دنیا سے باہر ہیں اور ان کے کاندھے عرشِ عظیم سے ملے ہوئے ہیں۔یہ سب ایسی تعبیرات و کنایات ہیں کہ ان کی قدرت کو اس عالم کے امور چلانے کے لیے واضح کرتے ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ ہم الفاظ کو ان کے حقیقی معانی پر منطبق کریں، مگر ایسی جگہ جہاں محکم عقلی قرائن موجود ہوں، کنائی معنی استعمال کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے، جیسے:

"يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ"

''خدا کی قدرت ان پر حاکم ہے۔''

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا"[1]

''جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرداگرد (تعینات) ہیں (سب) اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور مومنوں کے لیے بخشش کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔''

---

[1] سورۂ غافر: آیت ۷

فرشتوں کا معصوم ہونا

فرشتوں کی خصوصیات زیادہ ہیں۔ان میں کچھ کا اُوپر کی عبارتوں میں (مثلاً کچھ کا کام صرف عبادت کرنا ہے وغیرہ) تذکرہ ہو چکا ہے۔نہ آنکھوں کی نیند ستاتی ہے نہ تسبیحِ خداوندی سے تھکتے ہیں نہ سہو ونسیان ان پر طاری ہوتا ہے۔اسی طرح قرآن مجید میں وضاحت ہے کہ یہ گناہ ومعصیت سے آلودہ نہیں ہوتے:

"بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ"[1]

بلکہ (وہ فرشتے خدا کے) معزز بندے ہیں، وہ گفتگو میں اس سے سبقت نہیں کر سکتے اور وہ اسی کے حکم پر چلتے ہیں۔"

جبکہ عذاب پر مقرر فرشتوں کے متعلق ارشاد ہے:

"لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ"[2]

"اُس کے فرمان کی کبھی مخالفت نہیں کرتے۔"

بعض تصور کرتے ہیں کہ اس مقام پر معصوم ہونے یا نہ ہونے کا مفہوم نہیں نکلتا، جبکہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ یہ بات درست ہے کہ گناہ کے انگیزے مثلاً شہوت اور غضب ان میں نہیں ہے، مگر یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ یہ فاعل مختار ہیں اور مخالفت پر قدرت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ آیات سے معلوم ہوتا ہے:

"وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ"[3]

"وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔"

ان تمام تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ معصیت پر قدرت رکھتے ہوئے معصوم و گناہ سے پاک ہیں۔یہاں پر یہ بات بھی روشن ہوجاتی ہے کہ روایات میں آیا ہے کہ فرشتوں کی کوتاہیوں اور اس کی وجہ سے اللہ کی طرف سے انھیں تنبیہہ کی جاتی ہے۔یہ وہی ترک اولیٰ ہے، جس کا ذکر انبیاؑ کے باب میں بھی آیا ہے جو ہرگز گناہ نہیں ہے (بلکہ ممکن ہے دو مستحب کام ایک خوب اور دوسرا خوب تر ہو)

---

[1] سورۂ انبیاءؑ، آیات ۲۶، ۲۷

[2] سورۂ تحریم، آیت ۶

[3] سورۂ انبیاءؑ، آیت ۲۸

حاملانِ عرش کا مقامِ معرفت

وہ تعبیرات جو اوپر کی عبارت کی ذیل میں ذکر ہوئی ہیں، ان سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اگر حاملانِ عرش الٰہی اس عظیم کام پر مامور کیے گئے ہیں، تو یہ ان کی قدرت وطاقت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان کی خدا کے بارے میں معرفت کی وجہ سے ہے، یہ توحید کا اقرار ہر قسم کے شرک سے دوری کا نتیجہ ہے کہ اس عظیم ذمّے داری کے لائق قرار پائے ہیں۔ یہ بات درحقیقت تمام بندگان خدا اور خصوصی طور پر بنی نوع انسانیت کے لیے درس عبرت ہے۔

نواں حصّہ

ثُمَّ جَمَعَ سُبْحَانَهُ مِنْ حَزْنِ الْأَرْضِ وَ سَهْلِهَا وَ عَذْبِهَا وَ سَبَخِهَا تُرْبَةً سَنَّهَا بِالْمَاءِ حَتَّى خَلَصَتْ وَ لَاطَهَا بِالْبَلَّةِ حَتَّى لَزَبَتْ فَجَبَلَ مِنْهَا صُوْرَةً ذَاتَ أَحْنَاءٍ وَ وُصُولٍ وَ أَعْضَاءٍ وَ فُصُولٍ أَجْمَدَهَا حَتَّى اسْتَمْسَكَتْ وَ أَصْلَدَهَا حَتَّى صَلْصَلَتْ لِوَقْتٍ مَعْدُودٍ وَ أَمَدٍ [أَجَلٍ] مَعْلُومٍ ثُمَّ نَفَخَ فِيهَا مِنْ رُوحِهِ- [فَتَمَثَّلَتْ] فَمَثُلَتْ إِنْسَانًا ذَا أَذْهَانٍ يُجِيلُهَا وَ فِكَرٍ يَتَصَرَّفُ بِهَا وَ جَوَارِحَ يَخْتَدِمُهَا وَ أَدَوَاتٍ يُقَلِّبُهَا وَ مَعْرِفَةٍ يَفْرُقُ بِهَا بَيْنَ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ وَ الْأَذْوَاقِ وَ الْمَشَامِّ وَ الْأَلْوَانِ وَ الْأَجْنَاسِ مَعْجُوناً بِطِينَةِ الْأَلْوَانِ الْمُخْتَلِفَةِ- وَ الْأَشْبَاهِ الْمُؤْتَلِفَةِ وَ الْأَضْدَادِ الْمُتَعَادِيَةِ وَ الْأَخْلَاطِ الْمُتَبَايِنَةِ مِنَ الْحَرِّ وَ الْبَرْدِ وَ الْبَلَّةِ وَ الْجُمُوْدِ-

''اس کے بعد پروردگار نے زمین کے سخت ونرم اور کھارے اور شیریں حصوں سے خاک کو جمع کیا اور اسے پانی سے اس قدر بھگویا کہ بالکل خالص ہوگئی اور پھر تری میں اس قدر گوندھا کہ لیس دار بن گئی اور اس سے ایک ایسی صورت بنائی، جس میں موڑ بھی تھے اور جوڑ بھی، اعضا بھی تھے اور جوڑ بند بھی۔ پھر اسے اس قدر سُکھایا کہ مضبوط ہوگئی اور اس قدر سخت کیا کہ کنکھنانے لگی اور یہ صورت حال ایک وقتِ معین اور مدتِ خاص تک برقرار رہی، جس کے بعد اس میں مالک نے اپنی روحِ کمال پھونک دی اور اسے ایسا انسان بنادیا، جس میں ذہن کی جولانیاں بھی تھیں اور فکر کے تصرّفات بھی۔ کام کرنے والے اعضا و جوارح بھی تھے اور حرکت کرنے والے اوزار و آلات بھی، حق و باطل میں فرق کرنے والی معرفت بھی تھی اور مختلف ذائقوں، خوشبوؤں، رنگ وروغن میں تمیز کرنے کی صلاحیت بھی۔ اسے مختلف قسم کی مٹی سے بنایا گیا، جس میں موافق اجزاء بھی پائے جاتے تھے اور متضاد عناصر بھی اور گرمی، سردی، تری اور خشکی جیسی کیفیات بھی۔''

شرح وتفسیر

آدمؑ کی خلقت کا آغاز

خطبے کے گزشتہ عمیق حصوں میں زمین وآسمان کی تخلیق کے بارے میں اشارے ہوئے اور اب اس کائنات کی دوسری مخلوق کے بارے میں ذکر شروع ہوتا ہے، جہاں انسان کی خلقت کے مختلف مراحل کی نشاندہی کی گئی ہے، کیوں کہ انسان کی خلقت، خالقِ کائنات کا بڑا شاہکار ہے۔ اس کی زندگی کے مراحل کی طرف یوں ارشاد کیا:

۱۔ جسم وروح کے اعتبار سے آدمؑ کی خلقت۔

۲۔ فرشتوں کا آدمؑ کے لیے سجدہ اور ابلیس کا انکار۔ (اسی خطبے کا دسواں حصہ ملاحظہ فرمائیں)

۳۔ حضرت آدمؑ کا بہشت میں رہنا پھر ترکِ اولیٰ، اس کے بعد پشیمان ہوکر توبہ کرنا، بہشت کو چھوڑ کر زمین پر آنا۔ (گیارہواں حصہ ملاحظہ فرمائیں)

۴۔ اولادِ آدمؑ کا زیادہ ہونا اور خداوند عالم کا روحانی ومعنوی کمالات کے ساتھ اور آسمانی کتب کے ساتھ انسانی معاشرے کی تشکیل اور انسان کی ہدایت اور انسانی معاشرتی نظام کو چلانے کے لیے پیغمبروں کا بھیجنا۔ (بارہواں حصہ ملاحظہ فرمائیں)

۵۔ اس کے بعد انسانی معاشرے کا کامل سے کامل تر ہونا تا کہ دینی بالیدگی کا مرحلہ انجام تک پہنچے۔ اس مقام پر خداوند عالم نے اپنے رسول آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن مجید کے ساتھ انسانوں کی نجات اور ہدایت کی تعلیم اور انھیں اخلاق عالیہ سے مزین کر کے مبعوث فرمایا، اس مقام پر تعارف قرآن کے بارے میں بہت گہرے اور بیش قدر بیانات موجود ہیں۔ (تیرہواں حصہ ملاحظہ فرمائیں)

پہلا مرحلہ: جسم وروح کے اعتبار سے حضرت آدمؑ کی خلقت

حضرت آدمؑ کے جسم کی خلقت کے سلسلے میں ارشاد فرمایا ہے:

"ثُمَّ جَمَعَ سُبْحَانَهُ مِنْ حَزْنِ[1] الْاَرْضِ وَسَهْلِهَا، وَعَذْبِهَا[2] وَسَبَخِهَا[3] تُرْبَةً"

''پھر خداوند عالم نے سخت اور نرم زمین اور اسی طرح میٹھی اور شور مٹی کو جمع کیا۔''

حقیقت میں یہ ایک طرف تو انسان کے خاک سے پیدا ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری طرف اشارہ یہ ہے کہ زمین کے مختلف حصّوں سے خمیر بنایا گیا تا کہ زندگی کے مختلف اوقات میں اور انسانی معاشرے کی ضرورتوں کے وقت ان قسم قسم کی اور مختلف صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جا سکے اور انسان کے مختلف طبقات سے ان کی استعداد اور صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف کام لیے جا سکیں۔ پھر دوسرا مادّہ جو پانی اور مٹی سے بنایا گیا ہے، اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"سَنَّهَا[4] بِالْمَاءِ حَتّٰى خَلَصَتْ"

''اس پر پانی چھڑکا تا کہ خالص گارا بن جائے۔''

"وَلَاطَهَا[5] بِالْبَلَّةِ حَتّٰى لَزَبَتْ"[6]

''اسے گیلا کر دیا، یہاں تک کہ موجودہ صورت میں ظاہر ہو گیا۔''

حقیقت میں پانی کا کردار اس کو مختلف اجزا کے ساتھ ملانا اور ناہموار کو صاف کرنا اور بکھرے ہوئے مختلف اجزا کو جوڑنا تھا، پھر اس مٹی اور گارے سے انسان کی شکل بنانے کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

"فَجَبَلَ مِنْهَا صُوْرَةً ذَاتَ اَحْنَاءٍ[7] وَوُصُوْلٍ، وَاَعْضَاءٍ وَفُصُوْلٍ"

''پھر خدا نے اس سے انسان کی صورت تخلیق کی جس میں جُھکنے کی صلاحیت، جوڑ بند اور اعضا و جوارح تھے۔''

حقیقت میں احناء (حنو کی جمع ہے) جسم کے مختلف حصوں کا جُھکنے کی طرف اشارہ ہے۔ جیسے جبڑے اور پسلیوں کا جھکنا اور سر کے اوپر کے حصے کو پاؤں کی طرف جھکانا تا کہ جسم کو مختلف کاموں کے لیے تیار کیا جا سکے، کیونکہ اگر جسم ایک ہندسی شکل میں ہو تو ہرگز اس طرح کام نہیں کر سکتا۔ اور "وَاَعْضَاءٍ وَفُصُوْلٍ" کے جملے سے جسم کے مختلف اعضا مراد ہیں، جیسے

---

[1] ''حزن''، ''وزن'' کے وزن پر ہے، غم واندوہ اور روئے زمین کے سخت نقاط کو کہتے ہیں، دکھ اور غم کو "حَزْنِ" یا "حَزَنَ" بھی کہتے ہیں کیوں کہ غم روحِ بشری سے متعلق ہے۔

[2] عَذْبِ، جذب کے وزن پر ہے، پاکیزہ، صاف اور میٹھے پانی کو کہتے ہیں۔

[3] سَبِخَ، مَلِحَ کے وزن پر ہے، شورزدہ زمین کو کہتے ہیں اس کی جمع سباخ ہے۔

[4] سَنَّ، سَنَ کے مادّے سے، ظن کے وزن پر ہے، جو کسی چیز پر پانی انڈیلنے کو کہتے ہیں، اور کبھی نرم اور صاف چیز کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

[5] لَاطَ، لَوطَ کے مادّے سے، صوت کے وزن پر ہے۔ جو کسی چیز کے دوسری چیز میں ملنے کے معنی میں آتا ہے۔

[6] لَزَبَتْ، لُزُوب کے مادّے سے، سکوت کے وزن پر ہے جو ثبوت و لزوم کے معنی میں آتا ہے۔

[7] "اَحنَا"، "حِنْو" کی جمع ہے ''حرص'' کے وزن پر ہے، جو کجی اور خمیدگی کے معنی میں آتا ہے اور کبھی اطراف اور کنارے کے معنی میں آتا ہے۔

جوڑ و بند جو ایک دوسرے اعضاء سے جڑے ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے زیادہ کام کیے جا سکتے ہیں۔ انسان کے ہاتھ کو کہنی تک مدنظر رکھیں، اگر یہ سب ایک حصہ ہوتا اور ایک عضو اور ایک ہڈی ہوتی تو یہ بہت کم کام آتا، لیکن ہم جانتے ہیں کہ خداوند عالم نے کچھ ہڈیوں کے ٹکڑے اور کچھ اعضا اور جوڑ درمیان میں پیدا کیے، اسی وجہ سے ہر انگلی بلکہ ہر انگلی کے بند ہاتھ کے پنجے کے علاوہ ہیں اور ہر ایک کا ایک خاص کام ہوتا ہے اور یہ حکمت و عظمت پروردگار کی نشانیوں میں سے ہے۔

پھر، بعد کے مرحلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اَجْمَدَهَا حَتّٰى اسْتَمْسَكَتْ وَ اَصْلَدَهَا [1] حَتّٰى صَلْصَلَتْ" [2]

''پھر اسے اس قدر سُکھایا کہ مضبوط ہوگئی اور اس قدر سخت کیا کہ کنکھنانے لگی۔''

"لِوَقْتٍ مَعْدُوْدٍ وَ اَجَلٍ مَعْلُوْمٍ [3]

''اسی ترتیب سے جسم کو کامل کیا اور اسی حالت کو ایک وقتِ معین اور معین انجام تک برقرار رکھا۔''

بعض روایات میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ یہ حالت چالیس سال تک رہی، گویا حضرت آدمؑ کا جسم ایک گوشے میں رکھا ہوا تھا اور فرشتے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کہتے تھے کہ کس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے؟ [4] بعض محققین نے کہا ہے کہ یہ فاصلۂ زمانی ملائکہؑ کو آزمانے کے لیے یا کاموں میں انسانوں کو جلد بازی سے روکنے کے لیے اور معاملات میں غور و فکر رکھنے کے لیے تھا۔

دوسرا مرحلہ: روح پھونکنے کا مرحلہ

"ثُمَّ نَفَخَ فِيْهَا مِنْ رُوْحِهٖ فَمَثُلَتْ [5] اِنْسَانًا ذَا اَذْهَانٍ يُجِيْلُهَا [6]"

''پھر اس میں مالک نے اپنی روحِ کمال پھونک دی اور اسے ایسا انسان بنا دیا، جس میں ذہن کی جولانیاں بھی

---

[1] اصلدَ، صَلْد کے مادّے سے ہے، محکم اور صاف کو کہتے ہیں۔

[2] صلصل، صلصلۃ کے مادّے سے ہے، اور کسی چیز کے خشک ہونے کو کہتے ہیں اور کبھی خشک اور کبھی محکم کو کہتے ہیں۔

[3] اوقتِ معلوم کا لام ''الیٰ'' کے معنی میں آیا ہے، بعض لوگوں نے احتمال دیا ہے کہ لام علّت کا ہے، اور بعض نے درج بالا عبارت سے مراد یہ لی ہے کہ یہ حالت قیامت تک جاری رہے گی اور اس کے بعد بدن کے تمام پیوند کلّی طور پر گل جائیں گے، لیکن یہ احتمال بہت بعید ہے۔ کیوں کہ خلقتِ انسان کی بات ہو رہی ہے، ابھی نفخ روح کا مرحلہ بیان ہی نہیں ہوا۔

[4] فَبَقِيَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً مُلْقًى تَمُرُّ بِهِ الْمَلَائِكَةُ فَتَقُوْلُ لِاَمْرٍ مَا خُلِقْتَ؟ (منہاج البراعۃ ج ۲، ص ۴۴)

[5] اَمْثُلَت، مُثول کے مادّے سے ہے حُصول کے وزن پر۔ کھڑے ہونے اور اٹھنے کو کہتے ہیں۔

[6] يُجِيْلُ، اِجالۃ کے مادّے سے ہے، اس کا مصدر بابِ افعال ہے جس کا مادّہ جَول اور جَولان ہے، گھمانے اور ہلانے کو کہتے ہیں۔

تھیں۔'' تا کہ انہیں مختلف جہات میں حرکت دے اور ان میں سے ایک کو اپنے کام انجام دینے کے لیے استعمال کرے اور ان کاموں کے لیے اپنے اعضاء کو حکم دے۔

یہ تعبیر ان مختلف ذہنی و عقلی قوتوں کی طرف اشارہ ہے، جن میں سے ہر ایک کے ذریعے انسان اس سے مربوط کام میں استفادہ کرتا ہے اور پھر ان کی مدد سے اپنے منزل کی طرف گامزن رہتا ہے۔ (ان قوتوں سے مراد قوتِ ادراک، قوتِ حافظہ اور قوتِ خیال وغیرہ ہے) توجہ رہے کہ ذہن بھی اصل میں قوت کے معنی میں ہے۔ پھر عقل وفہم و درایت اور تمام عقلی قوتیں مراد لی گئی ہیں۔ مولا علیؑ نے اس عبارت کے ذریعے توجہ دلائی کہ ان میں سے ہر ایک اللہ کی عنایت ہے، مزید فرماتے ہیں: "وَ فِكَرٍ يَتَصَرَّفُ بِهَا" کہ انسان کے پاس ایسے افکار ہیں کہ جن کو (مختلف موجودات اور گوناگوں کاموں میں) استعمال کرتا ہے۔ کبھی یہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہ جملہ عطف تفسیری ہے اور سابقہ جملے کی وضاحت کر رہا ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں الگ الگ جملے اور ان میں سے ہر ایک کسی خاص حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

جملہ "ذا اَذْهَانٍ يُجِيْلُهَا" میں مراحل شناخت، تصور و تصدیق وفہم و درک کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اور جملہ ''وَ فِكَرٌ يَتَصَرَّفُ بِهَا'' میں ان افکار کی طرف اشارہ ہے کہ جو نفاذ کے مرحلے میں ہوتے ہیں اور ان کے ذریعے انسان مختلف اشیا میں تصرّف کرتا ہے (خیال رہے کہ فکر دراصل ذہنی حرکت اور تصرفات ذھنیہ کو کہا جاتا ہے) بہر حال فکر جمع کی صورت میں ہے، جیسے اذہان صیغہ جمع ہے، تا کہ بتایا جا سکے کہ قوت عقلی اور انسانی افکار کی بہت سی اقسام ہیں، فلاسفہ اور مفکرین نے اس سلسلے میں تاکید کی ہے۔ یاد رہے کہ انسان کی مختلف فکری صلاحیتوں میں اختلاف کی وجہ بھی یہی ہے۔ بہت سارے افراد کسی حصے میں طاقتور اور کسی حصے میں کمزور ہوتے ہیں اور دوسرے افراد اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ اس مسئلے میں ایسے عجیب اسرار وحقائق پوشیدہ ہیں کہ انسان ان میں جس قدر غور وفکر کرے، اُس کی معرفت الٰہی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے بعد دو چیزوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو انسان کو اپنے مطلوب تک پہنچنے میں مدد کرتی ہیں:

"وَ جَوَارِحَ يَخْتَدِمُهَا[1] وَ اَدَوَاتٍ يُقَلِّبُهَا"

''خدا نے انسان کو اعضا عطا فرمائے کہ جن سے وہ خدمت لیتا ہے، اور اوزار عنایت فرمائے کہ جن سے مقصد حاصل کرنے میں مدد لیتا ہے۔''

حقیقت میں ذہن انسانی چار مرحلوں سے گزر کر اپنے مقصد تک پہنچتا ہے:

پہلا مرحلہ: شناختِ ادراک (تصور و تصدیق) ہے اور اس کے بعد دوسرا مرحلہ: فکر و اندیشہ، پھر تیسرا مرحلہ: اعضا

---

[1] يَخْتَدِمُ اِخْتِدَام کے مادّے سے ہے، خدمت لینے کو کہتے ہیں۔

وجوارح کو حکم کرنا اور چوتھا مرحلہ: اس مقام پر جہاں تنہا اعضا و جوارح کارآمد نہیں ہیں، وہاں مختلف وسیلوں سے مدد لینا جو کہ خداوند عالم نے اس کائنات میں پیدا کیے ہیں؛ ان چار مرحلوں میں سے ہر ایک کی بہت سی اقسام ہیں۔ اہدافِ معین تک پہنچنا ،اچھے اور برے درست و نادرست اور مختلف محسوسات کی تشخیص ایک صلاحیت ہے کہ جو درحقیقت پانچواں مرحلہ ہے، جسے قوت تمیز و تشخص کہا جائے گا۔ اسی طرح محسوسات کی دنیا میں مختلف ذائقے، مختلف خوش بو اور مختلف رنگ و جنس ایک دوسرے سے خود کو جدا کرتے ہیں۔ حقیقت میں تشخیص کی قوتِ انسانی عقل کی قوت میں اہم ترین قوت ہے، جو معنوی امور مثلاً حق و باطل کی تمیز اور مادّی امور جیسے رنگ، خوشبو، بدبو اور ذائقوں دونوں کے بارے میں کارگر ہے۔ فرماتے ہیں:

"وَ مَعْرِفَةٍ يَفْرُقُ بِهَا بَيْنَ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ"

خداوند عالم نے انسان کو حق و معرفت کی شناخت کے لیے وہ قوت عطا کی ہے، جس کے ذریعے وہ حق و باطل کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتا ہے۔

اور اسی طرح، طرح طرح کے ذائقوں، رنگوں اور خوشبوؤں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے اور ان کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور اور توجہ ہے کہ بحث و گفتگو کو اس مقام میں امور مادی کے چار حصوں، چکھنا، سونگھنا، دیکھنا اور اجناس۔ جیسا کہ اس مقام میں انواع و اقسام کے موجودات جیسے زمین سے اگنے والے تمام پودے، حیوانات اور پرندگان وغیرہ، کی طرف اشارہ ہے۔ پر مرکوز رکھا گیا ہے۔ یہاں سننے اور قابل عمل چیزوں کی طرف اس لیے اشارہ نہیں کیا گیا ہے کہ مذکورہ بالا تین محسوسات بطور مثال ذکر ہوئے ہیں، کیوں کہ مذکورہ تینوں محسوسات کو سننے کے بعد یہ انسان (کا ذہن خود بخود) باقی دونوں محسوسات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

آیا تمیز و تشخیص کی یہ طاقت و قدرت ایک مستقل طاقت ہے یا ذہن و فکر کے مفہوم میں ہی شامل ہے جن کا سابق الذکر سطور میں تذکرہ آیا ہے؟

حضرت علی علیہ السلام کی عبارات سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ آپؑ نے اسے مستقل طور پر ایک قدرت شمار کیا ہے۔

"وَ الْاَذْوَاقِ وَ الْمَشَامِّ وَ الْاَلْوَانِ وَ الْاَجْنَاسِ"[1]

---

[1] جیسا کہ اوپر کہا گیا "وَ الاَذْوَاقِ وَ الْمَشامِّ وَ الاَلْوان وَ الاَجْناسِ" یہ جملہ حق و باطل پر عطف ہے۔ لیکن بعض علماء نے اسے معرفت پر عطف کیا ہے، لیکن امامؑ کے کلمات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا عطف زیادہ مناسب تر ہے۔ پس پہلے والے عطف کے مطابق تمیز کرنے کی قدرت سب کے لیے (یکساں) شامل ہوگی، اور دوسرے عطف کے مطابق تمیز کی قدرت بھی خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت شمار کی جائے گی، جیسے سونگھنے کی طاقت، یا دیکھنے کی طاقت، یا چکھنے کی طاقت۔

تمیز وتشخیص کی یہ قوت عقل وشعور انسانی کی مہمترین طاقت ہے۔ یہ طاقت رنگ، بو اور ذائقہ جیسے مادی اور امور محسوسہ کو بھی شامل ہے اور حق و باطل جیسے معنوی امور کو بھی شامل ہے۔

اس کے بعد مولا علیؑ اس گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے انسان کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک خصوصیت جو زندگی کے بہت سے مراحل کا سرچشمہ ہے، کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

"مَعْجُوْناً[1] بِطِيْنَةِ الْاَلْوَانِ الْمُخْتَلِفَةِ"

''اور اسے (انسان کو) طرح طرح کے رنگوں اور مختلف صلاحیتوں کا مرکب اور پیکر قرار دیا۔''

یہ تعبیر ممکن ہے انسان کی مختلف رنگوں اور ذاتوں کے اختلاف کی طرف اشارہ ہو، یا پھر جسم کے اجزا کے رنگوں کے اختلاف کی طرف کہ بعض مکمل سفید ہیں (جیسے آنکھوں اور ہڈیوں کی سفیدی) اور بعض مکمل کالے (جیسے بال) اور بعض کے دوسرے رنگ ہوتے ہیں اور ان رنگوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ملنا انسان کو ایک خاص خوبصورتی بخشتا ہے۔ ممکن ہے معنی اس سے بھی وسیع تر ہوں اور انسان کی تمام صلاحیتوں اور غریزوں کو شامل ہو۔

اس کے بعد ایک جیسی چیزوں مانند رگیں، اعصاب اور ہڈیاں جو ایک دوسرے سے زیادہ شمائل ومشابہت رکھتی ہیں اور طرح طرح کی ذمہ داریاں نبھاتی ہیں، کے بارے میں امام علی علیہ السلام مزید فرمایا:

"وَ الْاَشْبَاهِ الْمُؤْتَلِفَةِ"

''اس میں موافق اجزاء بھی پائے جاتے ہیں۔''

"وَ الْاَضْدَادِ الْمُتَعَادِيَةِ، وَ الْاَخْلَاطِ الْمُتَبَايِنَةِ مِنَ الْحَرِّ وَ الْبَرْدِ وَ الْبَلَّةِ وَ الْجُمُوْدِ"

''اور اسی طرح سردی، گرمی، رطوبت اور خشکی جیسی مختلف قوتوں اور اشیا کا مرکب قرار دیا گیا۔''

مذکورہ جملے میں چار طبیعتوں کی طرف اشارہ ہے۔ قدیم طب کے مطابق انسانی طبیعت چار قسم کی ہوتی ہے، اگرچہ موجودہ ڈاکٹر اس تقسیم بندی کو ان الفاظ میں قبول نہیں کرتے اور دیگر تعبیرات اپنی گفتگو میں لے آتے ہیں، مثلاً سردی اور گرمی کے بجائے بلڈ پریشر کے زیادہ ہونے اور کم ہونے کا ذکر کرتے ہیں اور رطوبت وخشکی کو بدن میں پانی کی زیادتی یا کمی سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہرحال مذکورہ تعبیرات جو کلامِ امامؑ میں ذکر ہوئیں، یہ سب اس اہم خصوصیت کو بیان کرتی ہیں کہ خداوند متعال نے انسانی جسم کو مختلف مواد اور کئی کیفیات وگوناگون صلاحیتوں اور غریزوں کا مرکب قرار دیا ہے اور یہی اختلاف انسانی فکر اور اس کی راہ ورِش کے اختلاف کا سرچشمہ ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ معاشرتی منصوبوں اور انسانوں کی ضروریات کو پورا

---

[1] معجوناً ترکیب کے اعتبار سے ''انساناً'' جیسا ہے، جو عبارت میں اس سے پہلے مذکور ہے۔

کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تا کہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ کام کرے اور اس طرح ایک مکمل معاشرہ تیار ہو جائے۔ بہر حال یہ ایک مستقل داستان ہے یہاں اس کی تشریح کی گنجائش نہیں ہے۔

اہم نکات

حضرت آدمؑ کی تخلیق

اس خطبے کی تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ کی خلقت مستقل بنیادوں پر تھی، یعنی دیگر پست وحقیر جانداروں کی طرح تکامل کے مراحل سے نہیں گزرا ہے، بلکہ موجودہ شکل وصورت میں ہی اس کی تخلیق ہوئی تھی، اسی بات کی طرف قرآن بھی رہنمائی کرتا ہے۔ البتہ قرآن اور نہج البلاغہ بایولوجی کی کتابیں نہیں بلکہ انسان سازی کی کتابیں ہونے کے ناطے ان میں عقائد واخلاق کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔ البتہ موقع ومحل کی مناسبت سے علومِ طبیعی بایولوجی وغیرہ کی جانب بھی اشارہ ضرور پایا جاتا ہے۔

لیکن آج کل کے علمی حلقوں میں جو نظریہ رائج ہے، وہ یہ ہے کہ تمام جاندار اس شکل میں نہیں تھے، جس میں آج ہیں بلکہ گہرے سمندروں کی تہہ میں مختلف شکلوں میں پیدا ہوئے اور پھر درجہ بدرجہ تکامل کی جانب گامزن ہوئے، گویا ایک نوع سے دوسری نوع کی شکل اختیار کرتے رہے اور پھر دریا سے چوپایوں اور پرندوں کی شکل میں زمین اور ہوا میں منتقل ہو گئے۔ اور انسان کو بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں مانتے۔ اس نظریے کے حامل افراد چند گروہوں میں تقسیم ہیں، لامارک اور ڈارون اور پھر جدید ڈارونسیزم اور موٹیسزم کے حامی افراد، ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے نظریات کے لیے دلائل پیش کرتے ہیں۔ اور ان گروہوں کے مقابل انواع ناقابلِ تغیر ہیں، کے قائل افراد کہتے ہیں کہ آغاز سے آج تک ہر جانور اپنی اپنی اسی شکل میں تھا، انھوں نے تحول اور تکامل کے مفروضے کے رد میں دلائل دیئے ہیں، جنھیں کسی اور مناسب موقع پر بیان کیا جائے گا، یہاں مختصراً چند دیگر موضوعات کی طرف اشارہ ضروری ہے:

۱۔ قرآن مجید اور نہج البلاغہ کے خطبوں میں انواع کے ثبوت اور عدم تغیّر کا بیان کم از کم انسان کے بارے میں پایا جاتا ہے مگر دوسرے موجودات کے بارے میں تصریح نہیں ہے، اگر چہ تحول اور تکامل والے نظریئے کے لوگ انسان کو بھی اس قبیلے میں شامل کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور قرآن اور نہج البلاغہ کی ایسی تعبیر اور تفسیر کرتے ہیں جو تحول وتکامل کے اثبات میں ہو، بلکہ یہ لوگ ان آیاتِ قرآنی اور خطبات کو اپنی تائید اور اپنے موضوع پر دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

۲۔ تکامل یا انواع کا ناقابل تغیر ہونا کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ جسے حسی و عقلی تجربات ودلائل کے ذریعے ثابت کرسکیں، کیونکہ ان کی جڑیں لاکھوں سال پرانی ہیں۔ اس بنا پر اس کے حامی ومخالف جو کچھ کہتے ہیں، مفروضوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ ان کے دلائل، ظن اور گمان پر مشتمل ہیں، لہٰذا ان کے کہنے سے انسان کی تخلیق سے مربوط آیات اور نہج البلاغہ کی عبارات کی نفی نہیں ہوسکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں سائنسی علوم مذہبی عقائد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، کیونکہ سائنسی مفروضے ہر روز تبدیل ہوتے رہتے ہیں لہٰذا ہوسکتا ہے کل نئی تحقیق ہو اور انواع کے عدم تغیر کو تسلیم کرلیا جائے، مثلاً حال ہی میں دنیا کی چند مطبوعات میں یہ خبر آئی ہے کہ بیس لاکھ سال پرانی، انسان کی کھوپڑیاں دریافت ہوئیں ہیں، جن میں اور آج کے انسان کی کھوپڑی میں کوئی فرق نہیں اس خبر نے تکامل کے مفروضے کو ہلا کر رکھ دیا ہے کیوں کہ وہ تو قائل ہیں کہ چند لاکھ سال پہلے والا انسان ہرگز آج کے انسان جیسا نہیں تھا۔ اس بات سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان مفروضوں میں کتنا دم ہے، جو ایک دریافت سے ہل کر رہ جاتے ہیں۔ البتہ طبیعی بات، سائنسی علوم میں اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں، کیوں کہ یہ ایک نظریئے پر بنیاد رکھ کر چلتے ہیں یہاں تک کہ دوسرا نظریہ آکر اسے ختم کرے۔

خلاصہ یہ کہ سائنسی مفروضے اور قطعی اور یقینی مسائل دو علیحدہ مسئلے ہیں۔ سائنس میں قطعی اور یقینی بات مثلاً پانی کا آکسیجن اور ہائیڈروجن سے مل کر بننا، ایک محسوس عمل ہے اور لیبارٹری ٹیسٹ سے یہ بات ثابت بھی ہے، جبکہ کتنی باتیں ہیں جو گمان اور ظن پر مبنی ہیں۔ [1]

جسم اور روح کی ترکیب

قرآن مجید کی آیات کے عین مطابق خطبے کے اس حصے میں جو کچھ آیا ہے، اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ انسان دو اصل سے خلق ہوا ہے ایک کی بنیاد، مادّہ یعنی پانی اور گیلی مٹی (دنیا کا انتہائی سادہ مواد) ہے اور دوسرے بنیاد، الٰہی روح جیسی والا مقام سے ترکیب ہوا ہے اور یہی بات انسان کے اندرونی تضادات کا راز بھی ہے۔ اس کی کچھ خواہشیں اس کو مادّی دنیا کی طرف کھینچتی ہیں اور کچھ خواہشیں اس کو فرشتوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ ایک طرف حیوانی صفات اور دوسری طرف ملکوتی اور روحانی سرشت رکھتا ہے۔ نیز اسی وجہ سے انسان کی ترقی وتنزل کا دائرہ وسیع ہوجاتا ہے۔ ترقی کی استعداد اور قابلیت اتنی ہے کہ ''اعلیٰ علیّین'' تک پہنچ سکتا ہے اور تنزل وانحطاط ایسا کہ ''اسفل السافلین'' میں شمار ہوسکتا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو

---

[1] مزید تفصیلات کے لیے کتاب ''ڈارون و آخرین فرضیہ ھای تکامل'' کی طرف رجوع کریں جبکہ اس کا مختصر بیان تفسیر نمونہ، ج۱۱۔ سورۂ حجر آیات ۲۶، ۴۴۔ میں بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اور جب تک ان ظنی مفروضوں کے خلاف ٹھوس اور یقینی قرائن نہ ملیں سائنس میں ان مفروضوں کو قبول کیا جاتا ہے، لیکن ان کی قاطعیت کا کسی کو ادعا نہیں ہوتا ہے۔

پاک و پاکیزہ انسانوں کی اہمیت کو بڑھا دیتی ہے کہ انھوں نے انحطاط اور تنزل کی ایسی وادیوں سے خود کو بچا کر سرخرو ہوئے اور یہ خصوصیت انسان کے علاوہ کسی اور مخلوق میں نہیں پائی جاتی ہے، بقول شاعر:

جان گشودہ سوی بالا بالھا　　تن زدہ اندر زمین چنگا لھا
ہے عروجِ فطرتِ انساں، شرف انسان کا　　یہ بدن ایک روز بن جائے گا کیڑوں کی غذا
میل جان اندر ترقی و شرف　　میل تن در کسب اسباب وعلف
روح کی ہے آرزو اعلیٰ مراتب کا حصول　　مال وزر دنیا میں حاصل ہو، بدن ہے چاہتا

روح کی طاقت عالمِ بالا کی طرف انسان کو لے جاتی ہے، مگر مادّی طاقت زمینی بن کر رہ جاتی ہے اور روح ہمیشہ ترقی و شرف پاتی ہے، مگر مادّی طاقت کا ہم و غم دنیوی مفادات ہیں۔

روح و مادّہ دو الٰہی طاقتیں　　مختلف ہوتی ہیں ان کی عادتیں
ایک طاقت ہے ترقی کی طرف　　اور اِک لاتی ہے پستی کی طرف

اور یہی وہ چیز تھی جس کو فرشتے حضرت آدم علیہ السلام کے خلق ہونے سے پہلے سمجھنے سے قاصر تھے۔ شاید حضرت آدمؑ کی خلقت کو ایک تکراری کام سمجھ رہے تھے اور اپنی تسبیح و تقدیس کو مدنظر رکھتے ہوئے اس تخلیق کو تحصیلِ حاصل (یعنی حاصل شدہ چیز کا حصول) جان رہے تھے اور یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت آدمؑ کی ملکوتی روح کو خدا نے اپنی طرف نسبت دی ہے:

"وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ"

''میں نے اپنی روح اس میں پھونک دی۔''[1]

ظاہر ہے کہ نہ خدا کے لیے جسم ہے، نہ اُس کے لیے روح، لہٰذا جب خدا کسی چیز کی نسبت اپنی طرف دیدے، مثلاً خدا کا گھر، خدا کا مہینہ، تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ چیز انتہائی عظمت والی ہے۔ اس وجہ سے کہ انسان کی روح میں خدا کی صفات کی نشانیاں مثل علم، قدرت اور خلاقیت پائی جاتی ہیں، درحقیقت خدا نے سب سے بہترین اور سب سے نیک ترین روح کو حضرت آدمؑ میں پھونکا ہے۔ اسی وجہ سے روح پھونکنے کے بعد خدا نے اپنے آپ کو احسن الخالقین (بہترین خلق کرنے والا) کہا۔

"ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ"[2]

---

[1] سورہ حجر، آیت ۲۹

[2] سورہ مؤمنون، آیت ۱۴

''پھر ہم نے اس (آدمؑ) کو ایک نئی خلقت عطا کی پس بابرکت ہے وہ اللہ جو سب سے بہترین خالق ہے۔''

کتنی دکھ کی بات ہے کہ انسان اتنی قابلیت وصلاحیت وکمال کی قدرت رکھتے ہوئے اس مقام وعہدے پر پہنچ سکنے کے باوجود جو اس کے انتظار میں ہے اور اس کے سائے میں تمام مخلوقات پر برتری حاصل کرسکتا ہے اور کرامتِ انسانی "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا" کے عظیم تاج کا سزاوار ہونے کے باوجود اس طرح گر جائے کہ "أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ"[1] ک ''وہ حیوان کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔''

انسان، کائنات کا عجوبہ

انسان حقیقت میں اس کائنات کی عجیب ترین مخلوق ہے، جس کے کچھ اسرار کی طرف امامؑ کے اس کلام میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً مختلف اعضا کا رکھنا اور مختلف قسم کی طاقتیں اور متضاد عناصر سے ترکیب ہونا اور مختلف عوامل سے تشکیل پانا جو بہت پیچیدہ اور معجون کی شکل میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ عالم کی تمام چیزیں اس کے وجود میں جمع ہیں۔ درحقیقت یہ انسان پوری کائنات کا چھوٹا سا ماڈل ونمونہ ہے اور یہ چھوٹا عالم بڑے عالم سے برابری کرتا ہے:

أَتَزْعَمُ أَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيرٌ وَفِيكَ انْطَوَى الْعَالَمُ الْأَكْبَرُ[2]

نہ گماں کر کہ تُو ہے ریزۂ خاک حاملِ عالمِ کبیر ہے تُو

انسان کی یہ خصوصیت ہمیں ایک طرف اس کی خلقت کی اہمیت سے آگاہ کرتی ہے تو دوسری طرف خلق کرنے والے کی عظمت وقدرت کی نشاندہی کرتی ہے:

زیبندۂ ستائش آن آفریدگار ریست کاردچنین دل آویز، نقشی زماء وطینی

لائقِ حمد ہے وہ خالقِ اکبر جس نے آب وگل سے کیے تخلیق حسین نقش ونگار

امامؑ کا مقصد اس کلام سے ان ہی دو نکتوں کی طرف اشارہ کرنا ہے، ایک خالق کی عظمت دوسرے مخلوق کی بلندی۔

دسواں حصّہ

[وَ الْمَسَاءَةِ وَ السُّرُورِ] وَ اسْتَأْدَى اللهُ سُبْحَانَهُ الْمَلَائِكَةَ وَدِيعَتَهُ لَدَيْهِمْ وَ عَهْدَ وَصِيَّتِهِ إِلَيْهِمْ فِي الْإِذْعَانِ بِالسُّجُودِ لَهُ وَ الْخُنُوعِ لِتَكْرِمَتِهِ فَقَالَ سُبْحَانَهُ [لَهُمْ] اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا

[1] سورۂ اعراف، آیت ۱۷۹

[2] تُو گمان کرتا ہے کہ ایک چھوٹا سا جسم ہے جبکہ تیرے اندر ایک بڑا عالم سمایا ہوا ہے۔ دیوان امیر المومنینؑ کی طرف رجوع کرنا ہے۔

إِبْلِيسَ- [وَ قَبِيلَهُ اعْتَرَتْهُمْ] اعْتَرَتْهُ الْحَمِيَّةُ وَ غَلَبَتْ [عَلَيْهِمْ] عَلَيْهِ الشِّقْوَةُ وَ [تَعَزَّزُوا] تَعَزَّزَ بِخِلْقَةِ النَّارِ وَ [اسْتَوْهَنُوا] اسْتَوْهَنَ خَلْقَ الصَّلْصَالِ فَأَعْطَاهُ اللهُ النَّظِرَةَ اسْتِحْقَاقاً لِلسُّخْطَةِ وَ اسْتِتْمَاماً لِلْبَلِيَّةِ وَ إِنْجَازاً لِلْعِدَةِ فَقَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ إِلى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ

پھر پروردگار نے ملائکہؑ کو حکم دیا کہ وہ اس کی امانت واپس کریں اور اس کی عہد لی گئی وصیت پر عمل کریں، یعنی اس مخلوق کے سامنے سر جھکا دیں اور اس کی کرامت کا اقرار کرلیں۔ چنانچہ اس نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو اور سب نے سجدہ بھی کرلیا سوائے ابلیس کے کہ اسے تعصب نے گھیر لیا اور بدبختی غالب آ گئی اور اس نے آگ کی خلقت کو عزت کا سبب اور خاک کی خلقت کو ذلت کی وجہ قرار دے دیا۔ مگر پروردگار نے اسے غضب کے مکمل استحقاق، آزمائش کی تکمیل اور اپنے وعدے کو پورا کرنے کے لیے یہ کہہ کر مہلت دے دی کہ ''تجھے وقتِ معلوم کے روز تک مہلت دی جا رہی ہے۔''

شرح وتفسیر

ابلیس کی گمراہی کا آغاز

اس خطبے کے پہلے حصے میں حضرت آدمؑ کی خلقت کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا اسی کا تسلسل ہے اور اس سے مربوط ایک اور موضوع کو یہاں امامؑ نے بیان فرمایا ہے جو کئی جہات اور زاویوں سے سبق آموز اور عبرت کا باعث ہے۔ پہلے آپؑ فرماتے ہیں کہ:

" وَ اسْتَأْدَى اللهُ سُبْحَانَهُ الْمَلاَئِكَةَ وَدِيعَتَهُ لَدَيْهِمْ وَعَهْدَ وَ صِيَّتِهِ إِلَيْهِمْ فِي الْإِذْعَانِ بِالسُّجُودِ لَهُ وَ الْخُنُوعِ[1] لِتَكْرِمَتِهِ فَقَالَ سُبْحَانَهُ اُسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ"

'' خدائے سبحان نے ملائکہؑ سے چاہا کہ وہ امانت جو ان کے پاس تھی، اُسے ادا کریں اور اس عہد و پیمان پر جو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے اور ان کے سامنے اظہارِ خضوع کے بارے میں خدا کے ساتھ باندھا تھا، اس پر عمل کریں۔ فرمایا: تم سب آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ سب نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے خدا نے پہلے فرشتوں سے وعدہ لیا تھا کہ جب آدم علیہ السلام خلق ہوں اور وہ کامل ہو جائیں تو ان کے لیے سجدہ کریں۔ یہ وہی چیز ہے جو قرآن

[1] خنوع، مقائیس اللغۃ کے کہنے کے مطابق اصل میں خضوع اور تواضع کے معنیٰ میں ہے اور دوسروں نے بھی اس جیسے معانی سے تعبیر کیا ہے۔

مجید کے سورۂ ص میں اس طرح ہے:

"اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلآئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا مِنْ طِيْنٍ ، فَاِذَا سَوَّيْتُهُ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهُ سَاجِدِيْنَ"[۱]

''یاد کرو اُس وقت کو جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا، میں ایک بشر کو مٹی سے خلق کر رہا ہوں، جب میں اُس کو منظم کر دوں اور اپنی روح اس میں پھونک دوں تو تم سب اس کے سامنے سجدے میں چلے جانا۔'' فرشتوں کے ذہن میں یہ مطلب موجود تھا؛ یہاں تک کہ حضرت آدمؑ خلق ہوئے اور ایک کامل انسان کی شکل اختیار کر گئے؛ پھر خدا نے فرشتوں کو اپنا وعدہ یاد دلایا اور اسے نبھانے کا حکم دیا:

"وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ"[۲]

''اور (وہ وقت بھی یاد کریں) جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔''

نہج البلاغہ کے بعض شارحین کے مطابق اس طریقۂ کار کی وجہ شاید یہ ہے کہ اگر تمہید و مقدمہ کے بغیر اچانک ان کو کوئی حکم دیا جاتا تو وہ تعجب کرتے اور شاید اس حکم کی تعمیل میں سستی کرتے، لیکن خدا نے پہلے ان کو اس کام کے لیے آمادہ کرایا تا کہ یہ باور کرایا جا سکے کہ تمام اہم کام مقدمہ سازی اور ضروری تیاریوں کے ساتھ ہی انجام پاتے ہیں۔

اس کے بعد ابلیس کی مخالفت کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اِعْتَرَتْهُ الْحَمِيَّةُ[۳] وَ غَلَبَتْ عَلَيْهِ الشِّقْوَةُ وَ تَعَزَّزَ بِخِلْقَةِ النَّارِ وَ اسْتَوْهَنَ خَلْقَ الصَّلْصَالِ"

''غم و غصّہ و تکبّر و خود بینی نے اُسے گھیر لیا اور بدبختی و شقاوت نے اس پر غلبہ کر لیا اور اپنی خلقت، آگ سے ہونے پر افتخار کیا اور آدمؑ کی خلقت سوکھی مٹی سے ہونے کو کمتر سمجھا۔''

درحقیقت ابلیس کی گمراہی کی اصل وجہ ایک لحاظ سے اس کی اندرونی خباثت تھی، جو شقاوت سے تعبیر کی گئی ہے اور دوسری طرف تکبّر اور غرور و تعصب اور انانیت تھی، جو اس کی باطنی خباثت کا نتیجہ تھا، جو اس کی فکر پر غالب آئی اور یہی چیز سبب

---

[۱] سورۂ ص، آیات ۷۱، ۷۲

[۲] سورۂ بقرہ، آیت ۳۴

[۳] اَلْحَمِيَّةُ، حَمِيَ کے مادّے سے نہی، کے وزن پر ہے۔ اصل میں وہ گرمائش ہے جو سورج یا آگ کی تپش سے یا دوسرے مواد سے اور یا انسان کی بدن کے اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ کبھی قوتِ غضب کو حمیّت سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ غضب کی حالت میں انسان شعلہ ور ہوتا ہے اور بخار کی حالت جو بدن کی گرمائش کا بنیادی سبب بھی ہے، حمّیٰ کہا جاتا ہے۔

ہوئی کہ اُس نے حقیقت سے چشم پوشی کی اور آگ کو مٹی پر فوقیت دی جبکہ مٹی تمام برکتوں اور فوائد کا سرچشمہ ہے۔ گویا ابلیس نے اپنے علم و دانش کو خدا کی حکمت سے بالاتر سمجھا۔

البتہ اس قسم کے فیصلے ایسے افراد سے جو اس قسم کے تکبّر و غرور کے حجابوں میں ہوں، تعجب کی بات نہیں ہے بعض اوقات خود پسندی کا شکار اور تکبّر و غرور کے پردوں میں چھپا انسان کسی پہاڑ کو تنکا اور کسی تنکے کو پہاڑ دیکھتا ہے اور دنیا کے بڑے بڑے دانشور غرور و تکبّر و خود خواہی کے پنجے میں گرفتار ہو کر بڑی بڑی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ یہاں پر شقاوت سے مراد وہی باطنی رکاوٹیں اور صفاتِ رذیلہ ہیں جو کہ شیطان میں موجود تھیں۔ یہ صفاتِ رذیلہ اس کی اپنی صفات تھیں جو کہ اس کے گزشتہ اعمال کا نتیجہ تھیں، وہ جبری صفات نہیں تھیں، کیونکہ شقاوت، سعادت کی ضد ہے۔ سعادت کا مطلب اصلاح کی طرف حرکت کرنے کے لیے تمام ضروری چیزوں کا فراہم ہونا ہے اور شقاوت سے مراد اس راستے میں رکاوٹ پیدا ہونا ہے۔

البتہ یہ تمام امور خود انسان کے رفتار و کردار اور دوسری موجودات کی مرضی اور ان کے اختیار سے وقوع پذیر ہوتی ہیں، جبری و زبردستی عوامل کی وجہ سے نہیں ہوتیں۔ بہرصورت ابلیس اس بڑے گناہ کی وجہ سے اپنے مقام سے گر گیا اور خدا کی درگاہ سے باہر نکالا گیا اور اپنے گناہ کی شدت کی وجہ سے خدا کی تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت اور راندۂ درگاہِ الٰہی قرار پایا۔ لیکن یہ دوری اور لعنت اس کے خواب غفلت سے جاگنے کا سبب نہیں بنی، وہ ہمیشہ غرور و تکبّر کی سواری پر سوار تھا جیسا کہ یہی طریقۂ کار تعصب اور تکبّر کے حامل لوگوں کا ہوتا ہے بلکہ اس نے ایک اور غیر معقول کام انجام دیا وہ یہ کہ حضرت آدمؑ کی اولادوں کو گمراہ کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گیا اور اپنی حسد و غصے کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس نے اپنے گناہوں کا بوجھ اور بھاری بنا دیا اور خدا سے چاہا کہ اُسے قیامت تک زندہ رکھے، چنانچہ قرآن میں آیا ہے:

"قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ"[1]

''شیطان نے کہا: پروردگارا! مجھے لوگوں کے پھر سے اٹھائے جانے تک مہلت دے دے۔''

خدا نے بھی اس کی خواہش کو تین وجوہات کی بنا پر قبول کیا:۔

پہلی وجہ یہ کہ وہ مکمل طور پر خدا کے غضب کا حقدار ہو جائے، دوسری وجہ یہ کہ خدا کے بندوں پر امتحان و آزمائش مکمل ہو جائے، تیسری وجہ یہ کہ خدا کو شیطان سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا تھا۔

"فَأَعْطَاهُ اللهُ النَّظِرَةَ اسْتِحْقَاقًا لِلسُّخْطَةِ وَ اسْتِتْمَامًا لِلْبَلِيَّةِ وَ إِنْجَازًا لِلْعِدَةِ"

لیکن مہلت دینے کے حوالے سے خدا نے شیطان کو معیّن وقت تک مہلت دی، اس کی خواہش کے مطابق مہلت

---

[1] سورۂ حجر، آیت ۳۶

نہیں دی۔اور فرمایا:

فَقَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ [۱]

''تم وقتِ معلوم تک مہلت پانے والوں میں سے ہو۔''

معیّن وقت سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں قرآن ونہج البلاغہ کی تفسیر کرنے والوں میں اختلاف ہے۔بعض نے کہا ہے، اس سے مراد دنیا کا خاتمہ اور احکام وتکلیف شرعی کے زمانے کا اختتام ہے۔اس صورت میں ابلیس کی درخواست کا کچھ حصہ منظور ہوا ہے، یعنی ابلیس قیامت تک مہلت مانگتا تھا لیکن خدا نے دنیا کے آخر تک اسے مہلت دی ہے۔دوسرا احتمال اس بارے میں یہ ہے کہ وقتِ معلوم سے مراد ابلیس کی عمر ہے اور اس کی عمر کب تک ہے، یہ صرف خدا جانتا ہے، کیونکہ اگر ابلیس کو اُس وقت سے باخبر کیا ہوتا تو اس کی نافرمانی وسرکشی زیادہ ہوسکتی تھی۔بعض افراد نے احتمال دیا ہے کہ وقتِ معلوم سے مراد، روز قیامت ہے کیونکہ سورۂ واقعہ میں قیامت کے بارے میں ہے:

''قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ'' [۲]

لیکن یہ احتمال بہت بعید ہے، کیونکہ اس تفسیر کے مطابق یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے ابلیس کی پوری درخواست منظور کرلی ہے، جب کہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ اس کی پوری خواہش کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ابلیس کے بارے میں جو آیت ہے، اس میں یوم وقت المعلوم کا لفظ ہے جبکہ سورۂ واقعہ میں ''یومِ معلوم'' کا ذکر ہے۔یہ دونوں تعبیریں مختلف ہیں، لہٰذا اس سلسلے میں صحیح تفسیر پہلی یا دوسری تفسیر ہے۔ایک حدیث میں یہ بھی آیا ہے: ''يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ'' سے قیام حضرت امام مہدی علیہ السلام کا زمانہ مراد ہے کہ اس وقت ابلیس کی عمر ختم ہوجائیگی۔ [۳] البتہ ابلیس کا مرنا اس بات کا سبب نہیں ہوگا کہ دنیا سے گناہ کے تمام اسباب ختم ہوجائیں گے اور اطاعت وامتحان کا مسئلہ ہی ختم ہوجائے (ایسا نہیں ہے) کیونکہ گمراہی کی اصل وجہ نفس کی خواہش ہے اور وہ اپنی جگہ باقی ہے، بلکہ شیطان کو گمراہ کرنے والی چیز بھی اس کی خواہش نفسانی ہے۔ [۴]

---

[۱] امام ؑ کا یہ فرمان سورۂ حجر، آیت نمبر ۳۷ و ۳۸ کی طرف اشارہ ہے (فَقَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ)

[۲] سورۂ واقعہ، آیت ۵۰

[۳] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۱۴ حدیث ۴۶

[۴] انسان کے منحرف ہونے میں نفسانی خواہشات اور شیطان کی تاثیر کے بارے میں امام علی بن الحسین علیہما السلام نے مناجات خمسۃ عشر کی دوسری مناجات میں راہنمائی فرمائی ہے۔

اہم نکات

مقامِ انسانی کی عظمت

اہم ترین دلیلوں میں سے ایک دلیل جو انسان کے تمام مخلوقات سے اشرف اور بہترین ہونے پر دلالت کرتی ہے، انسان کے لیے ملائکہؑ کے سجدے سے مربوط آیات ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم کی کئی سورتوں میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے۔[1]

ان آیتوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بلا استثنا، تمام ملائکہؑ نے حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ کیا اور خضوع و احترام کا اظہار کیا، جو کہ خود ایک واضح دلیل ہے کہ حضرت آدمؑ فرشتوں پر بھی فضیلت رکھتے ہیں۔ بظاہر قرآن کریم کا اس نکتے پر بار بار تاکید کرنے کا مقصد انسانوں کو اپنے معنوی مقام کی طرف توجہ دلانا ہے۔ یہی بات انسان کے نفس اور اس کی ہدایت میں بڑا کردار ادا کرتی ہے۔

حضرت آدمؑ کے لیے سجدے کی کیفیت کیا تھی؟

حضرت آدمؑ کے لیے سجدہ کرنے کا طریقۂ کار کیا تھا؟ کیا خدا کے علاوہ کسی کے لیے سجدہ کرنا جائز ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کا عقیدہ ہے کہ یہ سجدہ دراصل خدا کے لیے تھا، آدمؑ جیسی عجیب مخلوق کی خلقت پر اللہ کے لیے سجدہ تھا، لیکن حضرت آدمؑ کے سامنے اور ان کے مقابل میں سجدہ انجام پایا۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ سجدہ خود حضرت آدمؑ کے لیے تھا لیکن عبادت کا سجدہ نہیں تھا جو کہ صرف خدا کے لیے ہے بلکہ تعظیم اور احترام اور خضوع کا سجدہ تھا۔

کتاب عیون اخبار الرضاؑ میں امام علیؑ ابن موسیٰ الرضاؑ سے نقل ہے:

"كَانَ سُجُوْدُهُمْ لِلّٰهِ تَعَالٰى عُبُوْدِيَّةً وَلِآدَمَ اِكْرَامًا وَطَاعَةً لِكَوْنِنَا فِيْ صُلْبِهٖ"

فرشتوں کا یہ سجدہ خدا کے لیے بہ عنوان پرستش اور حضرت آدمؑ کے احترام و تعظیم کے لیے تھا، کیونکہ ہم (اہلِ

[1] سورۂ بقرہ: آیت ۳۴۔ سورۂ اعراف: آیت ۱۱۔ سورۂ اَسراء: آیت ۶۱۔ سورۂ کہف: آیت ۵۰، سورۂ طٰہٰ: آیت ۱۱۶

بیتؑ) آدمؑ کے صلب میں تھے۔[۱]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہؑ کے سجدے کی دو حیثیتیں تھیں، ایک خدا کی عبادت کی حیثیت، دوسری حضرت آدمؑ کے احترام کی حیثیت، گزشتہ تفسیر کی طرح سورۂ یوسف کی آیت میں بھی آیا ہے:

"وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا"۔[۲]

حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین کو تخت پر بلند کیا اور سب کے سب ان کے سامنے سجدے میں جھک گئے۔ امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے اسی آیت کے ذیل میں حدیث نقل ہوئی ہے، آپؑ فرماتے ہیں:

"اَمَّا سُجُوْدُ یَعْقُوْبَ وَوُلْدِهٖ فَاِنَّهٗ لَمْ یَکُنْ لِیُوْسُفَ وَاِنَّمَا کَانَ مِنْ یَعْقُوْبَ وَوُلْدِهٖ طَاعَةً لِلّٰهِ وَتَحِیَّةً لِیُوْسُفَ کَمَا کَانَ السُّجُوْدُ مِنَ الْمَلَآئِکَةِ لِآدَمَ"

''حضرت یعقوبؑ اور ان کے بیٹوں کا حضرت یوسفؑ کے لیے سجدہ عبادت والا سجدہ نہیں تھا، بلکہ ان کا سجدہ خدا کی اطاعت اور اُس کی عبادت اور حضرت یوسفؑ کے احترام کے لیے تھا، جس طرح ملائکہ نے حضرت آدمؑ کے لیے سجدہ کیا تھا۔''

شیطان کی خلقت سے متعلق مختلف سوالات

شیطان کی خلقت اور اس کی سابقہ ''عبادت'' اور خدا کے حکم سے سرکشی و نافرمانی پھر اس کو معیّن وقت تک مہلت دینے کے بارے میں بہت سارے سوالات جنم لیتے ہیں، ان تمام سوالات کا مفصل جواب دینے کے لیے ایک الگ اور تفصیلی مقالات کی ضرورت ہے، لیکن یہاں ہم مختصر طور پر کچھ اور اپنے موضوع سے مربوط چند سوالات تحریر کرنے پر اکتفاء کریں گے۔

سوال ۱: کیا ابلیس فرشتوں میں سے تھا؟ اگر جواب مثبت ہے تو؟ ملائکہؑ ہر قسم کے گناہوں سے معصوم ہیں تو پھر اتنے بڑے گناہ کا مرتکب کیسے ہوا؟ اگر جواب نفی میں ہے کہ ابلیس ملائکہؑ میں سے نہیں تھا تو پھر قرآن میں اس کا نام فرشتوں کے ساتھ کیوں آیا ہے؟

جواب: یقینی طور پر وہ فرشتوں میں سے نہیں تھا، کیونکہ قرآن نے واضح طور پر کہا ہے:

"کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ"

---

[۱] تفسیر نور الثقلین جلد اول، صفحہ ۵۸

[۲] سورۂ یوسف، آیت ۱۰۰

''ابلیس جنات میں سے تھا پس اس نے خدا کی نافرمانی کی۔''[۱]

لیکن اس سے پہلے وہ خدا کی عبادت واطاعت میں بڑی کوشش کرتا رہا، اسی وجہ سے اس نے فرشتوں کی صف میں جگہ پائی اور اگر کچھ تعبیروں میں مثلاً خطبہ ۱۹۲، قاصعہ میں شیطان کو ملک کہا گیا ہے تو اُس کی وجہ بھی یہی ہے، اس کے جنّ ہونے پر دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ خود کہتا ہے:

''خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ''

''تو نے مجھے آگ سے خلق کیا۔''

اور یہ معلوم ہے کہ جنات کو آگ سے خلق کیا گیا ہے۔[۲] فرشتوں کو آگ سے نہیں بنایا گیا اور جیسا کہ سورۂ رحمٰن میں آیا ہے:

''وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ''[۳]

''خدا نے جنات کو آگ سے پیدا کیا۔'' اہل بیتؑ کی روایات میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے۔[۴]

تیسری بات یہ کہ خدا نے قرآن میں ابلیس کی اولاد اور ذرّیت کے بارے میں بیان کیا ہے۔[۵] جبکہ فرشتوں میں اولاد پیدا کرنے کا سلسلہ نہیں ہے۔

سوال ۲: یہ کیسے ممکن ہے خدا ابلیس کو انسانوں پر اس طرح مسلط کرے کہ انسان اپنے دفاع کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو؟ اس کے علاوہ کیا ضرورت تھی ایسے گمراہ کرنے والے اور لوگوں کو اغوا کرنے والی مخلوق کو پیدا کرنے کی؟ یا یہ کہ اس کو خلق کرنے کے بعد اس کی عمر کو طویل کر دیا اور مہلت دے دی تا کہ وہ حضرت آدمؑ کی اولاد کو بہکانے میں انتہائی کوشش کرے اور کسی بھی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے؟

جواب: پہلی بات، یہ کہ شیطان شروع میں ایک پاک وجود کی حیثیت سے پیدا ہوا تھا اور کئی سال تک اس نے اپنی پاکیزگی کو بچایا اور اس کی حفاظت کی، یہاں تک کہ اسی اطاعت کی وجہ سے وہ ملائکہؑ کی صف میں شامل ہوا اور ان کی برابری کرنے لگا۔ لیکن آخر کار خود خواہی (انانیت) اور تکبّر وغرور اور اپنی مرضی سے سُوء استفادہ کی وجہ سے گمراہی کے راستے پر چل

---

[۱] سورۂ کہف: آیت ۵۰

[۲] سورۂ صٓ: آیت ۷۶

[۳] سورۂ رحمٰن، آیت ۱۵

[۴] مجمع البیان، جلد ۱، ص ۸۲، سورۂ بقرہ، آیت ۳۴ کے ذیل میں۔

[۵] سورۂ کہف، آیت ۵۰

پڑا اور انتہائی نچلے درجے پر جا گرا۔

دوسری بات، یہ کہ اس نکتے کی طرف توجہ دینا ضروری ہے کہ انسانوں میں شیطان کا نفوذ اور اس کا وسوسہ بے خبری یا زبردستی نہیں ہے، بلکہ انسان اپنی مرضی سے اس کے لیے دروازہ کھول دیتا ہے اور اپنی جان کی مملکت میں اس کے داخلے کی اجازت دیتا ہے۔ عام لفظوں میں یہ کہیں گے کہ انسان خود شیطان کے لیے اپنی مملکت میں داخلے کے لیے پاسپورٹ اور ویزا دیتا ہے، تب شیطان اس پر اثر دکھاتا ہے۔ قرآن مجید واضح طور پر کہہ رہا ہے:

"اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِیْنَ"[۱]

''تو میرے بندوں پر غالب نہیں ہوگا، مگر گمراہوں پر تیرا غلبہ ہوگا جو تیری پیروی کریں۔''

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

"اِنَّمَا سُلْطَانُهٗ عَلَى الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَهٗ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ"[۲]

''شیطان کا تسلط صرف ان لوگوں پر ہے جو شیطان کو اپنا سرپرست مان چکے ہیں اور اُس کے حکم کو اللہ کے حکم کے برابر مانتے ہیں۔''

تیسری بات، یہ کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے مذکورہ جملوں میں نہایت خوبصورت اور لطیف انداز میں اس سوال کا جواب دے دیا، آپؑ فرماتے ہیں خدا نے ابلیس کو مہلت دی تا کہ وہ مکمل طور پر خدا کے غضب کا حقدار ہو جائے اور اس طریقے سے خدا نے چاہا کہ بندوں کا امتحان لیا جائے اور شیطان سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا جائے۔ یعنی خدا نے ایک طرف مہلت دینے کے ساتھ اس کی سزا کو سخت بنا دیا، کیونکہ قرآنی آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ جو لوگ گمراہی کے راستے پر گامزن ہیں، خدا ان کو بار بار ہوشیار کرتا ہے اور اگر یہ تنبیہ اثر کرے اور وہ اپنے گناہوں سے باز آجائیں تو بہت اچھا ورنہ ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے اور پھر بہت زیادہ مہلت دی جاتی ہے، تا کہ ان کے گناہوں کا بوجھ زیادہ بھاری ہو جائے۔[۳]

دوسری طرف شیطان کا موجود ہونا انسانوں کے لیے بڑی آزمائش اور عبادت میں مومنین کی ترقی اور تکامل کا سبب ہے، کیونکہ ایسے طاقتور دشمن کا ہونا باخبر و ہوشیار اور راہ حق پر چلنے والے مومنین کے لیے نہ صرف نقصان دہ نہیں ہے، بلکہ ترقی و تکامل ہے، جو عام طور پر ٹکراؤ اور تضادات کی شکل میں ہوتی ہے، جب انسان ایک طاقتور دشمن کے مقابلے میں آتا ہے تو وہ

---

[۱] سورۂ حجر: آیت ۴۲

[۲] سورۂ نحل: آیت ۱۰۰

[۳] سورۂ آلِ عمران: آیت ۱۷۸

اپنی پوری مہارت وطاقت وذہانت کو بروئے کار لاتا ہے، دوسرے الفاظ میں ایسے طاقتور دشمن کا وجود انسان کی قوتِ مدافعت کو بڑھاتا ہے اور مسلسل جدوجہد کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں ترقی حاصل کر لیتا ہے، لیکن وہ لوگ جو نافرمان اور گناہ گار، دل کے بیمار ہیں، ان کی بدبختی اور گمراہی میں اضافہ ہوتا ہے۔ حقیقت میں وہ لوگ اسی تقدیر اور نتیجے کے حقدار ہیں:

"لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ"

''مقصد یہ تھا کہ شیطان کے وسوسوں کو امتحان قرار دیا جائے ایسے افراد کے لیے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور سنگدل ہیں۔''

"وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ"

''(نیز) مقصد یہ تھا کہ باخبر لوگ یہ جان لیں کہ یہ خدا کی طرف سے حق ہے اور وہ اس کے نتیجے میں اس پر ایمان لائیں اور خدا کے لیے ان کا دل نرم پڑ جائے۔''[1]

سوال ۳: شیطان کس طرح اپنے آپ کو حضرت آدمؑ سے بہتر سمجھتا تھا؟ اور خدا کی حکمت پر اعتراض کر رہا تھا؟

جواب: اس سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انانیت وغرور ایک دبیز پردے کی طرح ہے، جس کی وجہ سے انسان حق وحقیقت دیکھنے سے قاصر رہتا ہے اور اسی انانیت اور غرور نے ابلیس کو حقیقت دیکھنے سے روکا۔ ابلیس نہ صرف گناہ و نافرمانی کرنے پر تل گیا، بلکہ اس نے خدا کی حکمت ومصلحت پر اعتراض کرنا شروع کر دیا اور کہا، کیوں مجھ جیسی بہترین مخلوق کہ جو آگ سے خلق ہوئی ہے، پست تر وجود کو جو کہ مٹی سے خلق ہوا ہے، سجدہ کرے؟ سجدہ کرنے کا حکم کیوں مانوں؟ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آگ مٹی سے بہتر ہے، حالاں کہ مٹی تمام برکتوں اور زندگی کی تمام ضروری اشیاء کا ذریعہ اور زندگی گزارنے کا بہترین وسیلہ ہے اور اپنے اندر ہر قسم کے جواہرات اور قیمتی پتھر رکھتی ہے، جبکہ آگ ایسی نہیں ہے، یہ بات درست ہے کہ آگ بھی زندگی کا ایک عنصر ہے لیکن اصل کردار زمین میں موجود اشیاء کا ہے اور آگ ان اشیاء کے تکامل کا ذریعہ ہے۔

بعض احادیث میں آیا ہے[2] کہ شیطان کے جھوٹے دعووں میں سے ایک یہ تھا کہ وہ آگ کو مٹی سے بہتر سمجھتا تھا۔ جبکہ آگ عام طور پر درختوں یا چرب چیزوں سے حاصل ہوتی ہے اور یہ معلوم ہے درخت مٹی سے ہے اور جانوروں کی چربی و نباتات کا تیل وغیرہ سب کے سب زمین ہی سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت آدمؑ کی برتری صرف مٹی کی

---

[1] سورۂ حج: آیات ۵۳، ۵۴

[2] تفسیر نور الثقلین، جلد ۴، ص ۴۷۲، حدیث ۹۳

آگ پر برتری کی وجہ سے نہیں تھی، بلکہ حضرت آدمؑ کی فضیلت ان کی ملکوتی روح کی وجہ سے تھی کہ خدا نے کہا: "وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ" "میں نے اپنی روح اُس میں پھونک دی۔" سے تعبیر کر کے اُس کو فضیلت اور مقام دیا ہے۔ اگر مان بھی لیں کہ شیطان کا ابتدائی مادّہ (آگ) حضرت آدمؑ کے ابتدائی مادّہ (مٹی) سے بہتر ہے، پھر بھی یہ سبب نہیں بنتا کہ شیطان حضرت آدمؑ کے سامنے خضوع وسجدہ نہ کرے جو کہ الٰہی روح کا مالک اور خدا کا نمائندہ ہونے کا شرف رکھتے تھے۔ شاید شیطان کو یہ سب پتا تھا لیکن اس کے غرور وتکبّر اور انانیت نے اس کو حقیقت کے اعتراف سے روکے رکھا۔

جاہلوں کی بے بنیاد تاویلیں

بعض فلاسفہ (جنہیں ابن میثم بحرانی نے اپنی شرح نہج البلاغہ میں نقل کیا ہے) یہ تمام موضوعات جو حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت، فرشتوں کا سجدہ کرنے اور شیطان کی نافرمانی وسرکشی کے بارے میں نقل ہوئے ہیں، ان سب کی تاویل اور توجیہہ کرتے ہیں اور ان مفاہیم کو تبدیل کر دیتے ہیں، جو ان کے ظاہر سے معلوم ہوتے ہیں، مثلاً وہ کہتے ہیں فرشتوں سے مراد (جنہیں خدا نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا) بدن کی مختلف قوتیں ہیں، جن کو قوتِ عقل وروح کے مقابل خضوع کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور ابلیس سے مراد قوت وہم ہے اور ابلیس کا لشکر وہی ہے جو قوت وہم یعنی ہوائے نفس سے نکلتا ہے جو کہ قوت عقل کے مقابل ہے اور اس بہشت سے مراد جہاں سے حضرت آدمؑ کو نکالا گیا تھا حقیقی معارف اور خدا کے نورِ کبریائی کے مطالع وغیرہ وغیرہ۔[1]

یہ سب تفسیر بالرائے کی واضح مثالیں ہیں اور یہ بات معلوم ہے کہ اپنی رائے سے تفسیر کرنا اور آیات وروایات کو اپنے ذہنی مطالب پر پرکھنا، گمراہ اور فریب کار اور بدعت ایجاد کرنے والوں کا طریقۂ کار رہا ہے، یہ لوگ قرآنی آیات اور احادیث اپنی مرضی کے مفہوم پر ڈھالنا چاہتے ہیں اور وہ معنی جو خدا اور اُس کے نمائندوں نے بتائے ہیں، چھوڑ دیتے ہیں اور اگر تفسیر بالرائے (اپنی رائے سے تفسیر بیان کرنا) شروع ہو جائے تو کوئی بھی قانون ثابت نہیں ہو سکے گا اور ہر چیز ہر کس و ناکس کے باطل نظریات اور ان کی خواہشاتِ نفس کی بھینٹ چڑھ جائے گی، اور قرآن واحادیث ایک موم کے ٹکڑے کی طرح ہو جائیں گے، جسے گمراہ و بے خبر لوگ جس طرح چاہیں اور جس شکل میں چاہیں تبدیل کریں۔

اسی وجہ سے اسلام کے بڑے محققین تاکید کرتے ہیں کہ قرآن واحادیث کو سمجھنے کے لیے طے شدہ قوانین سے استفادہ ضروری ہے اور الفاظ کو ان کے اصلی معنی پر محمول کرنا چاہیے، قرینہ، مجازی معنی پر موجود ہو تو اس معنی پر پرکھا جا سکتا

---

[1] نہج البلاغہ شرح ابن میثم، جلد ۱، ص ۱۹۰ کے بعد۔

ہے۔ایسے قرائن ہوں جو عقلا کے ہاں قابل قبول ہوں اور وہ اپنی دلیلوں میں اُنہیں استعمال کرتے ہوں۔[۱]

بہرحال ابلیس کی داستان اور اس کے انجام کا ذکر مولا علیؑ کے اس کلام میں سب کے لیے ایک درس عبرت ہے تا کہ وہ تکبّر، غرور اور خود ستائی کا نتیجہ دیکھ لیں اور ابلیس کا آخری انجام، ابدی لعنت اور بدبختی تک پہنچنا کافی ہے کہ انسان اس خطرناک وادی میں قدم نہ رکھے، اس گفتگو کو ہم بزرگ عالم مرحوم مغنیہ کے کلام پر ختم کرتے ہیں، جو انھوں نے شرح نہج البلاغہ میں فرمایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ و ابلیس کی اس داستان سے مندرجہ ذیل درسِ عبرت حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ جو کسی بھی فضیلت والے فرد سے حسد کرے یا کسی انسان کے ریاست وحکومت میں شریک ہونے کی بنا پر دشمنی کرے، وہ ابلیس کے دین کو ماننے والا ہے اور قیامت کے دن اس کے ساتھیوں میں شمار ہوگا۔

۲۔ معرفتِ دین اور اخلاق حسنہ کی صرف ایک راہ ہے اور وہ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اور اس پر ثابت قدم رہنا ہے چاہے نتیجہ کچھ بھی ہو۔

۳۔ بہت سے لوگ باطل پر اصرار کرتے ہیں، یعنی یہ کہ باطل کو جانتے ہوئے بھی اس پر ڈٹ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ دشمنی اور ضدی طبیعت ہے، اگر چہ وہ لوگ اس کام کے بُرے نتیجے کو جانتے ہیں، اگر ابلیس توبہ کر لیتا اور اپنی غلط راہ کو ترک کر دیتا تو خدا اس کی توبہ قبول کر لیتا اور وہ اسے معارف بھی کر دیتا، لیکن وہ اپنی تئیں یہ شرط لگا رہا تھا کہ توبہ کرنے کے بعد خدا اسے پھر حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم نہ دے، جبکہ خدا نے اس کی توبہ قبول کرنے کے لیے آدمؑ کو سجدہ کرنے کی شرط رکھی تھی۔[۲]

گیارہواں حصّہ

ثُمَّ أَسْكَنَ سُبْحَانَهُ آدَمَ دَارًا أَرْغَدَ فِيهَا [عِيشَتَهُ] عَيْشَهُ وَ آمَنَ فِيهَا مَحَلَّتَهُ وَ حَذَّرَهُ إِبْلِيسَ وَ عَدَاوَتَهُ فَاغْتَرَّهُ عَدُوُّهُ نَفَاسَةً عَلَيْهِ بِدَارِ الْمُقَامِ وَ مُرَافَقَةِ الْأَبْرَارِ فَبَاعَ الْيَقِينَ بِشَكِّهِ وَ الْعَزِيمَةَ بِوَهْنِهِ وَ اسْتَبْدَلَ بِالْجَذَلِ وَجَلًا وَ [بِالْاِعْتِزَازِ] بِالْاِغْتِرَارِ نَدَماً ثُمَّ بَسَطَ اللهُ سُبْحَانَهُ لَهُ فِي تَوْبَتِهِ وَ لَقَّاهُ كَلِمَةَ رَحْمَتِهِ وَ وَعَدَهُ الْمَرَدَّ إِلَى جَنَّتِهِ وَ أَهْبَطَهُ إِلَى دَارِ الْبَلِيَّةِ وَ تَنَاسُلِ الذُّرِّيَّةِ۔

''اس کے بعد پروردگار نے آدمؑ کو ایک ایسے گھر میں ساکن کر دیا، جہاں کی زندگی خوش گوار اور مامون ومحفوظ تھی اور پھر انہیں ابلیس اور اس کی عداوت سے بھی باخبر کر دیا، لیکن دشمن نے ان کے جنت کے قیام اور نیک بندوں کی رفاقت سے جل

---

[۱] مزید وضاحت کے لیے آیت اللہ مکارم کی کتاب ''تفسیر بالرّای'' کی طرف رجوع کریں۔

[۲] فی ظلال نہج البلاغہ، جلد ۱، ص ۵۱

کر انہیں دھوکا دے دیا اور انہوں نے بھی اپنے یقینِ محکم کو شک اور عزمِ مستحکم کو کمزوری کے ہاتھوں فروخت کر دیا اور اس طرح مسرت کے بدلے خوف کو لے لیا اور ابلیس کے کہنے میں آ کر ندامت کا سامان فراہم کر لیا۔ پھر پروردگار نے ان کے لیے توبہ کا سامان فراہم کر دیا اور اپنے کلماتِ رحمت کی تلقین کر دی اور ان سے جنت میں واپسی کا وعدہ کر کے انہیں آزمائش کی دنیا میں اتار دیا، جہاں نسلوں کا سلسلہ قائم ہونے والا تھا۔

شرح وتفسیر

حضرت آدمؑ کی عبرت انگیز داستان

گزشتہ بحثوں میں فرشتوں اور ابلیس کے امتحان کے بارے میں گفتگو تھی۔ یہاں حضرت آدم علیہ السلام کے امتحان اور اس آزمائش کے نتیجے کے بارے میں بحث ہے۔ قرآن کی آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام زمین پر رہنے کے لیے خلق کیے گئے تھے۔ سورہ بقرہ میں ہے:

"اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً"[1]

''میں زمین میں اپنا نمائندہ قرار دینے والا ہوں۔''

نیز قرآن کی دوسری آیات سے سمجھ میں آتا ہے زمین سے مراد جنت کے علاوہ کوئی اور جگہ تھی، البتہ اس سے غرض نہیں کہ جنت کے کچھ بھی معنی مراد لیے جائیں۔ کیونکہ سورۂ بقرہ میں ہے:

"قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَّلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ"[2]

ہم نے (آدمؑ وحواؑ اور شیطان سے) کہا کہ زمین پر اُتر جاؤ، اگرچہ تم یہاں ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ زمین کو تمہارے لیے ایک معین مدت تک جائے سکونت قرار دیا۔''

بہرحال یہ بات ضروری تھی کہ حضرت آدمؑ کچھ عرصہ الٰہی آزمائش میں مبتلا رہیں اور امر و نہی، اطاعت، تکلیف و نافرمانی، پشیمانی، توبہ جیسے مفاہیم سے باخبر ہو جائیں اور عملی میدان میں اپنے دشمن کو اچھی طرح پہچان لیں، اسی وجہ سے خدا نے اُنھیں جنت میں بھیجا اور بہترین نعمتوں سے استفادہ ان کے لیے مباح قرار دیا۔ بس ایک درخت کے نزدیک جانے سے

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۳۰

[2] سورۂ بقرہ، آیت ۳۶

منع کیا۔ لیکن شیطان کے وسوسے اور اس کے دھوکے و فریب نے آخر کار اثر دکھایا اور حضرت آدم علیہ السلام سے ترکِ اولیٰ سرزد ہوا اور ممنوعہ درخت سے کھانے کے نتیجے میں جنتی لباس سے محروم ہوئے اور انھیں جنت سے نکال دیا گیا۔ یہی چیز سبب ہوئی کہ وہ خوابِ غفلت سے جاگ جائیں اور خدا کی طرف توبہ کے دروازے سے پلٹ جائیں۔ خدا کا لطف ان کے شامل حال ہوا اور توبہ کرنے کا طریقہ انھیں سکھایا، پھر ان کی توبہ قبول ہوئی اور دوبارہ جنت کی طرف پلٹانے کا وعدہ کیا گیا، لیکن ان کے اس اقدام کا اثر یہ ہوا کہ انھیں نعمتوں سے بھرپور جنت سے الگ کر کے آزمائشوں، زحمتوں اور مشقتوں سے بھری دنیا میں بھیج دیا گیا۔ یہ وہ خلاصہ ہے، جو مولاؑ کے کلام سے سمجھ میں آتا ہے اور پھر دوبارہ خطبے کے متن پر غور کرتے ہیں۔

پہلے مرحلے میں آپؑ فرماتے ہیں:

"ثُمَّ اَسْكَنَ سُبْحَانَهُ اٰدَمَ دَارًا اَرْغَدَ [1] فِيْهَا عَيْشَهُ"

''پھر خدائے سبحان نے حضرت آدمؑ کو ایسے گھر میں رہائش دی، جہاں اُن کی زندگی نعمتوں سے بھری ہوئی تھی اور وہ آرام دہ جگہ تھی۔''

"وَ آمَنَ فِيْهَا مَحَلَّتَهُ"

''اور اُس جگہ کو امن و امان کی جگہ قرار دیا۔''

زندگی کے دو بنیادی عناصر یعنی نعمتوں کی فراوانی اور امن و سکون وہاں جمع تھے۔ سورۂ بقرہ میں اللہ فرماتا ہے:

"وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا" [2]

''ہم نے آدمؑ سے کہا تم اور تمہاری بیوی جنت میں بس جاؤ اور اُس کی پاکیزہ نعمتوں سے جب اور جہاں سے بھی چاہو استفادہ کرو۔''

"وَحَذَّرَهُ اِبْلِيْسَ وَ عَدَاوَتَهُ"

''اور اُسی وقت حضرت آدمؑ کو ابلیس اور اس کی دشمنی سے آگاہ کر دیا تھا۔''

اور اس طرح اللہ نے انھیں راہِ سعادت اور چاہِ شقاوت دونوں سے آشنا کر دیا اور ان پر اپنی حجت تمام کر دی تھی اور یہ وہ بات ہے جس کا ذکر سورۂ طٰہٰ میں اشارہ ہے:

---

[1] ارغد، رغد کے مادّے سے صمد کے وزن پر ہے اصل میں اس کے معنیٰ اچھی زندگی اور وسیع زندگی ہے اور نعمت زیادہ ہونا انسانوں کے لیے یا حیوانوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ (مفردات و مقائیس اللغۃ)

[2] سورۂ بقرہ، آیت ۳۵

"فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى" [۱]

''ہم نے کہا، اے آدمؑ یہ (ابلیس) تمہارا اور تمہاری زوجہ کا دشمن ہے۔ پس یہ تم دونوں کو جنت سے نکلوانہ دے، پھر تم زحمت ومشقت میں مبتلا ہوجاؤ گے۔''

یہ بھی اتمامِ حجت تھا کہ دوسرے درختوں سے استفادے کا راستہ کھلا رکھا، لیکن اس راستے کے اس نئے مسافر کو شیطان کے مکروفریب سے خوب آگاہی نہیں تھی اور بالآخر اس کے دھوکے میں آ گیا، جس کی جانب مولاؑ اشارہ فرمارہے ہیں:

"فَاغْتَرَّهُ عَدُوُّهُ نَفَاسَةً [۲] عَلَيْهِ بِدَارِ الْمُقَامِ وَمُرَافَقَةِ الْأَبْرَارِ"

''دشمن نے انھیں دھوکا دیا، کیوں کہ ابلیس حضرت آدمؑ سے ہمیشہ رہنے والی جگہ اور فرشتوں کی ہم نشینی کی وجہ سے حسد کرتا تھا۔''

اصولی طور پر شیطان کا کام یہی ہوتا ہے کہ خود نیک لوگوں کے برابر ہونے کی اور سعادت مندوں کے راستے پر چلنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ وہ کوشش کرتا ہے دوسروں سے بھی خدا کی نعمتیں چھن جائیں اور ان کی زندگی تاریک ہوجائے۔

پھر امامؑ حضرت آدمؑ کے دھوکا کھانے کی اصل وجہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

"فَبَاعَ الْيَقِيْنَ بِشَكِّهٖ"

''آدمؑ نے اپنے یقین کو شک کے بدلے فروخت کیا۔''

"وَالْعَزِيْمَةَ بِوَهْنِهٖ" [۳]

'' اور انھوں نے اپنے دو مضبوط ارادوں کو (جو شیطان کے وسوسوں اور فریب کے مقابلے کے لیے استعمال کر سکتے تھے) سُستی کے بدلے فروخت کر دیا۔''

یہ کلام بھی قرآن کریم کی ایک اور آیت کی طرف اشارہ ہے، جہاں خدا فرماتا ہے:

---

[۱] سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۱۷

[۲] نفاسۃ، اصل میں ''نفس'' سے ہے جس کے وزن پر یہ لفظ روح کے معنیٰ میں لیا گیا ہے۔ اس وجہ سے کہ تنفس (یعنی سانس لینا) زندگی کا سبب ہے، لہٰذا یہ لفظ زندگی کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، پھر منافسہ کسی اہم مقصد تک پہنچنے کے لیے کوشش کرنے کے معنی میں ہے اور اسی وجہ سے نفاسۃ حسد اور کنجوسی کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ (مفردات، مقائیس اللغۃ ولسان العرب)

[۳] شکہ اور وھنہ کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں دو احتمال ہیں۔ نہج البلاغہ کی شرح کرنے والوں نے اس کو حضرت آدمؑ کی طرف پلٹایا ہے، یعنی آدمؑ نے اپنے یقین کو شک میں اور پکے ارادے کو سُستی میں تبدیل کیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ دونوں ضمیریں ابلیس کی طرف پلٹ جائیں، کیونکہ شک اور سُستی کو ابلیس نے پیدا کیا تھا، یعنی درحقیقت یہاں سبب کی طرف اشارہ ہے مفعول کی طرف اشارہ نہیں، لیکن بہرحال پہلا احتمال زیادہ صحیح لگتا ہے۔

"وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا"

''ہم نے آدمؑ سے عہد لیا تھا کہ شیطان سے دھوکا نہ کھائیں، لیکن اُنھوں نے وعدے کو فراموش کر دیا اور ہم نے آدمؑ کے اندر پکّا ارادہ نہیں پایا۔''[۱]

یہ بات درست ہے کہ شیطان نے آدمؑ کے سامنے قسم کھائی کہ وہ اُن کا خیر خواہ ہے اور آدمؑ اور ان کی بیوی کی بہتری چاہتا ہے:

"وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ"[۲]

''اور ان دونوں سے قسم کھا کر کہا کہ بیشک میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔''

لیکن آدمؑ کی ذمّے داری کیا تھی؟

کیا حضرت آدمؑ کو اللہ کے وعدوں پر اعتماد کرنا چاہیے تھا؟ کہ جو یقین کے سرچشمے کا حاصل ہیں یا پھر شیطان کی باتوں پر جو سراسر شک اور وہم پر مشتمل ہیں۔ اس حقیقت کو بھلانا سبب ہوا کہ حضرت آدمؑ اس نقصان و خسارے کے معاملے کا شکار ہو جائیں اور اللہ کی اطاعت کے سلسلے میں پکے ارادے سے ہٹ کر سُستی کا شکار ہوئے اور یہ بات تمام فرزندانِ آدمؑ کے لیے درسِ عبرت ہے کہ ہر حادثے و واقعے میں صرف اور صرف یقینی بات پر اعتماد کریں اور مشکوک اور مبہم راستوں سے گُریز کریں۔ اور احتیاط کو ہمیشہ ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ کسی راستے پر ضروری مطالعہ و غور و خوض کے بغیر قدم نہ رکھیں، کیونکہ ہمیشہ شیطان اپنے فساد انگیز ارادوں کو خوبصورتی کے ساتھ زینت دیتا ہے اور اپنے جلا دینے والے جہنم کو سرسبز و شاداب باغ کی شکل میں دکھاتا ہے۔ ہاں! حضرت آدمؑ کی پوری داستان میں تمام انسانوں کے لیے قیامت تک کے لیے بہت سی عبرتیں اور سبق آموز نکات موجود ہیں۔ پھر امامؑ نے اس نقصان دہ معاملے کے نتیجے کی طرف اشارہ کیا، آپؑ فرماتے ہیں:

"وَاسْتَبْدَلَ بِالْجَذَلِ[۳] وَجَلًا[۴] وَبِالْاِغْتِرَارِ نَدَمًا"

''آدمؑ نے مسرت کے بدلے خوف کو لے لیا اور ابلیس کے کہنے میں آ کر ندامت کا سامان فراہم کر لیا۔''

---

[۱] سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۱۵

[۲] سورۂ اعراف، آیت ۲۱

[۳] جذل، جدل کے وزن پر صحاح اللغۃ کے مطابق خوشی کے معنی میں ہے اور مقائیس اللغۃ کے مطابق قول جذل (جسم) کے وزن پر درخت کی جڑ جو درخت کو سیدھا رکھتی ہے، کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ خوشحال شخص کے لیے اس وجہ سے استعمال کیا گیا ہے کہ وہ شخص سیدھے قد والا ہوتا ہے اور غمگین شخص کی کمر جھکی ہوتی ہے، کبھی جھکی ہوتی ہے کبھی زمین کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ خوشی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

[۴] وجل، اجل کے وزن پر اصل میں ڈر اور خوف کے معنی کے لیے وضع ہوا ہے۔

اس کام کا نتیجہ یہ ہوا کہ آدمؑ نے اپنی خوشی کو غم اور خوف و گھبراہٹ میں تبدیل کر دیا اور شیطان کا دھوکا اُن کے لیے پشیمانی کا باعث ہوا، لیکن وہ کون سے واقعات تھے، جن کے سبب آدمؑ اپنے ترکِ اولیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور افسوس و پشیمانی سے اپنی انگلی چبانے لگے؟ اس بات کو امامؑ نے اجمالی طور پر بیان فرمایا ہے جبکہ قرآنِ کریم نے اس کی تشریح مختلف سورتوں میں کی ہے۔ جب انہوں نے شیطان کے وسوسوں میں آ کر درخت ممنوعہ سے کھایا، تھوڑی مدت نہ گزری تھی کہ جنت کا لباس ان کے جسم سے الگ ہو گیا اور جسم کے جو حصّے چھپانے چاہئیں تھے وہ ظاہر ہو گئے۔ اس وجہ سے یہ لوگ فرشتوں کے سامنے شرمسار ہونے لگے اور اس سے بڑھ کر بات یہ کہ ان کو جنت سے جلدی نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔ یہ ہے ان لوگوں کی سزا جو خدا کے حکم کو چھوڑ کر شیطانی وسوسوں کا شکار ہوتے ہیں اور اپنی شخصیّت اور مقام کو پامال کرتے ہیں اور ان کو جنت سے نکالا جاتا ہے۔ یہاں پر حضرت آدمؑ اپنے ترک اولیٰ پر اصرار کرنے کی بجائے جلدی اس کی تلافی کرنے کی فکر کرنے لگے۔

چونکہ حضرت آدمؑ نے خدا کی طرف قدم بڑھانا شروع کیا، اسی وجہ سے خدا کی رحمت اور لطف ان کے شامل حال ہوا اور خدا نے اپنی رحمت کے کلمات حضرت آدمؑ کو سکھائے اور ان سے دوبارہ جنت میں واپس پلٹنے کا وعدہ کیا:

"ثُمَّ بَسَطَ اللهُ سُبْحَانَهُ لَهُ فِي تَوْبَتِهِ وَلَقَّاهُ كَلِمَةَ رَحْمَتِهِ وَوَعَدَهُ الْمَرَدَّ إِلَى جَنَّتِهِ"[1]

''پھر پروردگار نے ان کے لیے توبہ کا سامان فراہم کر دیا اور اپنے کلماتِ رحمت کی تلقین کر دی اور ان سے جنت میں واپسی کا وعدہ کیا۔''

لیکن حضرت آدمؑ کی یہ توبہ جنت میں دوبارہ رہنے کی کوئی وجہ نہیں بن سکی، کیونکہ آدمؑ کو جنت میں باقی رہنے کی کوئی دلیل و ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ جو کچھ وہاں پر سیکھنا تھا وہ سیکھ لیا اور جو تجربہ وہاں حاصل کرنا تھا وہ حاصل کر چکے تھے۔ اسی وجہ سے خدا نے حضرت آدمؑ کو امتحان گاہ یعنی دنیا اور نسل بڑھانے کے لیے زمین پر بھیج دیا۔

"وَأَهْبَطَهُ إِلَى دَارِ الْبَلِيَّةِ وَتَنَاسُلِ الذُّرِّيَّةِ"

''اور انہیں آزمائش کی دنیا میں اتار دیا، جہاں نسلوں کا سلسلہ قائم ہونے والا تھا۔''

---

[1] جنتہ، کی ضمیر خدا کی طرف پلٹتی ہے یا حضرت آدمؑ کی طرف؟ اس میں اختلاف ہے؛ اگر یہ ضمیر حضرت آدمؑ کی طرف لوٹے تو اس صورت میں جنت سے مراد وہی جنت ہوگی جہاں حضرت آدمؑ پہلے تھے، اور اگر ضمیر خدا کی طرف پلٹ جائے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ مراد وہی جنت ہو، بلکہ ممکن ہے آدمؑ کی یہ جنت دنیاوی ہو یا ہمیشہ رہنے والی جنت جہاں حضرت آدمؑ کو دوبارہ پلٹایا جائے گا، لیکن ظاہر یہی ہے کہ ضمیر خداوندِ سبحان کی طرف پلٹی ہے۔ توبتہ اور رحمتہ کی ضمیر کے مرجع کے قرینے کے مطابق اگرچہ ''مَرَدّ'' کا لفظ ظاہراً اسی سابقہ جنت کی طرف پلٹ جانا ہے لیکن مطلق جنت یا دوسری عبارت میں نوعِ جنت کی طرف پلٹنا ،مَرَدّ، کے لفظ سے غیر ہم آہنگ بھی نہیں۔

اس کلام سے اچھی طرح یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دنیا امتحان کی اصل جگہ ہے اور جنت میں جو کچھ ہوا وہ سب دنیا میں آنے کے لیے تمہید و مشق تھا اور اسی طرح تناسل و توالد کا دارومدار بھی دنیا کے ساتھ ہے، نہ کہ جنت کے ساتھ۔

نکات

۱۔ حضرت آدمؑ کی جنّت کون سی تھی؟

کچھ لوگ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت آدمؑ بہشتِ موعود اور ہمیشہ رہنے والی جنت میں تھے، جو خدا نے نیک و پاکیزہ لوگوں کے لیے معیّن فرمائی ہے، جبکہ کچھ اور افراد اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ اسی دنیا کے سرسبز و شاداب باغات تھے یعنی وہ دنیا کی ایک جنت تھی۔ اور انھوں نے اپنی اس بات کو چند دلیلوں سے ثابت کیا ہے:

پہلی دلیل یہ ہے کہ قیامت کی جنت ایک ہمیشہ رہنے والی نعمت ہے، اس سے خارج ہونا ممکن نہیں ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ ابلیس کے لیے ان تمام گناہوں کی آلودگیوں اور کفر و طغیان کے باوجود کس طرح ممکن ہوا کہ وہ اس پاک و پاکیزہ اور مقدس جگہ پر قدم رکھے؟ اگر کہا جائے کہ ابلیس حضرت آدم علیہ السلام کو وسوسہ دینے کے لیے جنت کے اندر ہرگز نہیں آیا تھا، بلکہ باہر کھڑا ہو کر حضرت آدم علیہ السلام کو وسوسہ دے رہا تھا۔ تو یہ بات سورۂ بقرہ کی آیت:

"وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ"[1]

اور (بالآخر) ہم نے حکم دیا کہ تم نیچے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔"، کے ساتھ موافق نہیں ہے۔

اس کے علاوہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے نقل ہونے والی بہت سی روایات میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ آدمؑ کی جنت اسی دنیا کے باغوں میں سے ایک سرسبز باغ تھا۔

ان روایات میں سوال کیا گیا تو معصومؑ نے فرمایا:

"جَنَّةٌ مِنْ جِنَانِ الدُّنْيَا يَطْلُعُ عَلَيْهَا الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَلَوْ كَانَتْ مِنْ جِنَانِ الْخُلْدِ مَا خَرَجَ مِنْهَا اَبَدًا"

"وہ جنت اسی دنیا کے حسین باغوں میں سے ایک سرسبز و شاداب باغ تھا۔ جہاں سورج اور چاند کی روشنی پڑتی

---

[1] سورۂ بقرہ: آیت ۳۶

تھی۔اگر وہ جنت خلد ہوتی تو ہرگز حضرت آدمؑ وہاں سے باہر نہیں آتے۔''[۱]

مرحوم شیخ کلینیؒ نے کتاب کافی میں ایک اور حدیث اسی مضمون سے مشابہ ''حسین بن میسّر'' سے اورانہوں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کی ہے۔[۲]

اس نظریے پر صرف ایک اشکال وارد ہوسکتا ہے اور وہ نہج البلاغہ کی مذکورہ عبارت میں آنے والی تعبیر ہے۔ جہاں آپؑ فرماتے ہیں: ''نَفَاسَةً عَلَيْهِ بِدَارِ الْمَقَامِ'' شیطان ان سے ہمیشہ رہنے والے گھر کی وجہ سے حسد کرتا تھا، اسی لیے اُنھیں دھوکا دیا اور شبہے میں مبتلا کر دیا۔لیکن ممکن ہے اس تعبیر سے یہ مراد ہو کہ اگر آدمؑ اس ترکِ اولیٰ کے مرتکب نہ ہوئے ہوتے تو لمبی مدت تک اسی جنت میں رہتے اور پھر اس کے بعد اس سرزمین پر قدم رکھتے، لیکن یہ ترکِ اولیٰ باعث ہوا کہ وہ جلد ہی جنت سے نکال کر زمین کی طرف بھیج دیے گئے۔ اس تعبیر سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شیطان چاہتا تھا حضرت آدمؑ کو ابدی جنت سے محروم کردے، کیونکہ اگر آدمؑ وہاں ہر اعتبار سے خدا کے فرمانبردار ہوتے تو ہمیشہ رہنے والی جنت کی طرف لے جائے جاتے۔

۲۔کیا حضرت آدم علیہ السلام گناہ کے مرتکب ہوئے؟

وہ لوگ جو انبیاءؑ کے لیے گناہ کا مرتکب ہونا خاص طور پر اس جیسے موارد میں جائز سمجھتے ہیں، ان کو اس بات کے کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام گناہ کے مرتکب ہوئے، لیکن مکتبِ اہلِ بیتؑ کے پیروکار عقیدہ رکھتے ہیں کہ انبیائے کرامؑ ہر قسم کی خطا اور غلطی سے پاک اور محفوظ ہیں۔خطائیں چاہے عقیدہ اور دین کی تبلیغ سے مربوط ہوں یا روزمرہ زندگی سے مربوط ہوں، نبوّت سے پہلے سے مربوط ہوں یا نبوّت کے بعد سے بہرصورت انبیاء کرامؑ خطاؤں اور گناہوں سے پاک ہیں۔

لہٰذا مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام کے پیروکاروں[۳] کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام سے کسی طرح گناہ اور خطا سرزد نہیں ہوا

---

[۱] بحار الانوار، جلد ۱۱، ص ۱۴۳، حدیث ۱۲

[۲] کتاب کافی، ج ۳، ص ۲۴۷، باب ''جنت الدنیا'' حدیث ۲

[۳] ابن ابی الحدید کہتا ہے کہ امامیہ اس بات کے قائل ہیں کہ خدا ایسے شخص کو نبوت کے لیے مبعوث نہیں کرتا ہے جو نبوت سے پہلے کسی بُرے کام کو انجام دے، وہ بُرا کام چاہے گناہِ کبیرہ ہو یا گناہ صغیرہ جان بوجھ کر کرے یا غلطی سے، یہ نظریہ مذہب امامیہ سے مخصوص ہے کیونکہ ہمارے علماء (اہلسنّت) نبوت سے پہلے گناہ کبیرہ کے ارتکاب کو ممنوع جانتے ہیں، لیکن گناہِ صغیرہ کا ارتکاب اگر نفرت کا سبب نہ بنے تو اسے جائز جانتے ہیں۔اس کے بعد وہ اضافہ کرتے ہیں کہ امامیہ یہی نظریہ اپنے بارہ اماموں کے بارے میں بھی رکھتے ہیں اور ان کے لیے بھی انبیاءؑ کی طرح مطلق عصمت کے قائل ہیں۔
(شرحِ نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۷ صفحہ ۱۰)

پس خدا نے جو درخت سے حضرت آدم علیہ السلام کو منع کیا تھا وہ نہی تحریمی (جس کام پر حرمت صدق آئے) نہیں تھی، بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے یہ کام صرف مکروہ جیسا عمل تھا۔ البتہ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ انبیاءؑ کا مرتبہ بہت بلند ہے، خصوصاً حضرت آدمؑ جو کہ مسجودِ ملائکہ تھے، ایسی شخصیت سے مکروہ کام کی انجام دہی کی بھی توقع نہیں رہتی، لہٰذا اگر ان سے اس طرح کا کوئی کام سرزد ہو جاتے تو خدا کی طرف سے مؤاخذہ بھی سخت ہوگا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے:

"حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ"

''نیک لوگوں کے اچھے کام مقرب بندوں کے لیے گناہ شمار کیے جاتے ہیں۔''

دوسری عبارت میں یہ کہا جا سکتا ہے گناہ دو قسم کے ہیں، ایک مطلق گناہ دوسرا نسبی گناہ۔

مطلق گناہ وہ کام ہے جو ہر صورت میں گناہ ہے، مثلاً جھوٹ بولنا، چوری کرنا، شراب پینا وغیرہ، لیکن نسبی گناہ وہ کام ہے جو عام لوگوں کے لیے گناہ شمار نہیں ہوتا ہے، شاید کچھ افراد کی نسبت وہی کام نیک کام شمار ہو، لیکن یہی مستحب یا مباح کام اگر خدا کے مقرّب بندوں سے انجام پائے تو ان پر عصیان (گناہ) کا اطلاق ہوتا ہے۔ مثلاً نمازِ شب پڑھنا عام لوگوں کے لیے بہت زیادہ قابلِ توصیف عمل ہے، مگر مقربینِ خدا کے لیے صرف نمازِ پنجگانہ پڑھنا اور کبھی کبھی نمازِ شب کا ترک ہو جانا قابلِ مذمت عمل ہے۔

لہٰذا حضرتِ آدم علیہ السلام کا یہ کام نسبی گناہ شمار کیا جاتا ہے اور ترکِ اولیٰ سے بھی یہی معنی مقصود ہیں۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے ممنوعہ درخت سے جو ''نہی'' کی تھی، وہ نہی مولوی نہیں تھی، بلکہ وہ نہی ارشادی تھی، مثلاً ڈاکٹر کی ہدایت کہ فلاں کھانا مت کھائیں، وگرنہ آپ کی بیماری طول پکڑے گی۔ ظاہر ہے اگر ڈاکٹر کی ہدایت کی مخالفت کریں تو یہ نہ تو ڈاکٹر کی توہین ہے اور نہ ہی ڈاکٹر کے حکم کی نافرمانی، بلکہ اس کا نتیجہ وہ درد اور سختی ہے جو اس مخالفت کی وجہ سے اُٹھانا پڑے گی، قرآن کی کچھ آیات اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

"فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى"

''ہم نے آدمؑ سے کہا، یہ (ابلیس) آپ اور آپ کی زوجہ کا دشمن ہے ہوشیار رہیں، مبادا آپ کو جنت سے باہر نکال دے؛ اگر ایسا ہو گیا تو آپ زحمت و مشقّت میں مبتلا ہو جائیں گے۔''[1]

کچھ روایات میں یہ بات آئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس ممنوعہ درخت سے ہرگز نہیں کھایا، بلکہ اس درخت کے جیسے دوسرے درخت سے کھایا تھا۔ لہٰذا شیطان نے وسوسہ پیدا کرتے وقت کہا، خدا نے اس درخت سے آپ کو منع نہیں کیا

---

[1] سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۱۷

یعنی دوسرے درخت سے منع کیا ہے:

"وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ" [۱]

''خدا نے اس درخت سے آپ کو منع نہیں کیا،'' یعنی دوسرے درخت سے منع کیا ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ کرنا بھی ضروری ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ ابلیس نے حضرت آدمؑ سے قسم کھاتے ہوئے کہا، میں آپ کا خیر خواہ ہوں اور بھلائی چاہتا ہوں، لہٰذا آپ اس درخت سے کچھ کھالیں:

"وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ" [۲]

''اور ان دونوں سے قسم کھا کر کہا کہ بیشک میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔''

کیونکہ نہ آدمؑ نے اور نہ حوّا نے اب تک جھوٹی قسم سنی تھی، اسی لیے اس کی جھوٹی قسم کے دھوکے میں آ گئے۔ البتہ اگر وہ غور و فکر سے کام لیتے تو شیطان کا جھوٹ سمجھ میں آ جاتا، کیونکہ اس سے پہلے خدا سے سن چکے تھے کہ شیطان اُن کا دشمن ہے اور دشمن کی قسموں پر یقین نہیں کرنا چاہیے اور دشمن کو اپنا خیر خواہ نہیں سمجھنا چاہیے۔

۳۔ وہ ممنوعہ درخت کیا تھا؟

جس درخت سے حضرت آدم علیہ السلام کو کھانے سے منع کیا تھا، وہ کسی عام درخت کی طرف اشارہ ہے یا معنوی اور اَخلاقی چیز ہے، اگر مادّی یا معنوی ہے تو کس درخت اور کون سی اَخلاقی صفت کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بارے میں مفسرین کے درمیان بحث و گفتگو ہے۔ اگرچہ حضرت امیر المومنینؑ کے اس خطبے میں اس چیز کی طرف (واضح) اشارہ نہیں ہے، لیکن ابلیس کا آدمؑ کو دھوکا دینا اور ان کو وسوسہ کرنے کی داستان کی طرف آپؑ نے اشارہ فرمایا ہے، اِس لیے مناسب ہے کہ بحث کی تکمیل کے لیے یہاں اس موضوع کے بارے میں مختصر بحث ہو۔

قرآن کریم میں چھے مقامات پر اس ممنوعہ درخت کی طرف اشارہ ہوا ہے، البتہ اس کی تشخیص کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی ہے، لیکن اسلامی روایات اور احادیث اور مفسرین کے کلام میں بہت سی بحثیں موجود ہیں، بعض نے اس کو گندم کے درخت سے تعبیر کیا ہے۔ [۳]

اس بات کی طرف توجہ دینی چاہیے کہ عربی زبان میں شجر کا لفظ موٹے درختوں کے لیے اور نیز سبزیات اور چھوٹے

---

[۱] سورۂ اعراف: آیت ۲۰، تفسیر نور الثقلین جلد ۲، صفحہ ۱۱، حدیث ۳۴

[۲] سورۂ اعراف: آیت ۲۱

[۳] وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ، سورۂ صافّات: آیت ۱۴۶

نہال کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت یونسؑ کی کہانی میں کدو، لوکی کے نہال کے لیے بھی شجر کا لفظ استعمال ہوا ہے، بعض نے شجر سے مراد انگور کی بیل اور بعض دیگر نے انجیر اور دوسروں نے خرما اور بعض نے کافور سے تعبیر کیا ہے۔ معنوی اعتبار سے بعض نے اس سے آل محمد علیہم السلام کے علوم مراد لیا ہے جبکہ بعض دیگر نے حسد مراد لیا ہے اور بعض مفسرین نے متعلق علم سے اس کی تفسیر کی ہے [۱]۔

حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے نقل شدہ ایک حدیث میں ہے کہ جب آپؑ سے اس درخت سے متعلق، وایات اور کلمات کے اختلافات کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا: یہ سب باتیں صحیح ہیں، کیونکہ جنت کے درخت دنیا کے درختوں سے مختلف ہیں، وہاں پر کچھ درخت انواع واقسام کے پھلوں کے حامل ہیں۔ اس بات سے بڑھ کر جب خدا نے حضرت آدم علیہ السلام کو احترام واکرام سے نوازا اور فرشتوں نے ان کے لیے سجدہ کیا اور انھیں جنت میں جگہ دی گئی۔ حضرت آدمؑ نے دل میں سوچا کہ کیا خدا نے مجھ سے بہتر کوئی مخلوق خلق کی ہے؟ خدا نے محمدؐ وآلِ محمدؐ کے مقام ومرتبہ کو حضرت آدمؑ کے سامنے پیش کیا، جس پر حضرت آدمؑ کے دل میں تمنا ہوئی کہ کاش میں بھی اس مقام پر ہوتا۔ [۲]

اس نکتے کا ذکر یہاں ضروری ہے کہ موجودہ تورات میں شجرِ ممنوعہ سے مراد شجر علم ودانش ہے (یعنی اچھائی اور بُرائی کی پہچان) اور اسے ہمیشہ رہنے والی زندگی سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ خدا نے حضرت آدمؑ وحوّا کو اس سے منع کیا تھا کہ مبادا وہ اس بات سے باخبر ہو جائیں اور وہ دونوں ہمیشہ رہنے والی زندگی حاصل کر کے خداؤں کی طرح بن جائیں۔ [۳] یہ تعبیر واضح علامتوں میں سے ہے کہ موجودہ تورات اصلی نہیں ہے بلکہ کم علم وکم فہم افراد کے دماغ کا بنایا ہوا کلام ہے۔ یہ لوگ علم ودانش کو آدمؑ کے لیے عیب سمجھتے ہیں اور آدمؑ کو علم ودانش کے گناہ میں جنت سے راندہ درگاہ سمجھتے ہیں۔ گویا ان کی نظر میں جنت سمجھدار لوگوں کی جگہ نہیں ہے، البتہ کچھ اسلامی روایات اور احادیث میں شجرِ ممنوعہ کو علم ودانش کا درخت کہا گیا ہے۔ یہ روایات تحریف شدہ تورات سے لی گئی ہیں اور جعلی روایات ہیں۔

۴۔ حضرت آدم علیہ السلام کو توبہ کے لیے سکھائے گئے کلمات

امامؑ کے مذکورہ کلام میں ہم صرف اتنا پڑھتے ہیں کہ حضرت آدمؑ نے خدا سے رحمت کے کلمات لیے لیکن ان کلمات کی تشریح کے بارے میں کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ قرآن کریم میں بھی اجمالی طور پر بیان ہوا ہے کہ جہاں صرف کلمات کے

---

[۱] تفسیر نور الثقلین، جلد ۱، صفحہ ۶۰، الدر المنثور، جلد ۱، ص ۵۲، ۵۳، سورۂ بقرۂ: آیت ۳۵ کے ذیل میں رجوع کریں۔

[۲] نور الثقلین، جلد ۱، ص ۶۰ (خلاصے کے ساتھ)

[۳] تورات سفرِ تکوین، فصل دوّم، نمبر شمار ۱۷

لینے کا ذکر ہے۔ البتہ یہ بھی طے ہے کہ یہ کلمات بہت اہم مطالب پر مشتمل تھے۔ چنانچہ بعض نے کہا ہے کہ ان کلمات سے مراد خدا کے سامنے گناہوں کا اقرار ہے، جو قرآن کریم کے سورۂ اعراف میں بیان ہوا ہے:

"رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ"۔[۱]

''خدایا ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اگر تُو ہمیں معاف نہیں کرے گا اور رحم نہیں کرے گا تو یقیناً ہم نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔''

بعض نے اسی گناہ کے اقرار اور بخشش طلب کرنے کو دوسری عبارت میں نقل کیا ہے:

"لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ عَمِلْتُ سُوْٓءً ا وَ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْٓ اِنَّكَ خَیْرُ الْغَافِرِیْنَ"۔[۲]

اسی مضمون کی کچھ روایات حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور حضرت امامِ صادق علیہ السلام سے نقل شدہ موجود ہیں[۳] لیکن بہت سی احادیث میں ان کلمات سے مراد پنجتن پاکؑ (محمدؐ و علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ) ہیں۔ چنانچہ کتاب خصال میں ابن عباسؓ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھتے ہیں کہ حضرت آدمؑ نے خدا سے جو دریافت کیا تھا، وہ کیا چیز تھی؟

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

"سَاَلَهٗ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَ عَلِیٍّ وَ فَاطِمَةٍ وَ الْحَسَنِ وَ الْحُسَیْنِ اِلَّا تَابَ عَلَیْهِ فَتَابَ اللّٰهُ عَلَیْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ"

حضرت آدمؑ نے پنجتن پاکؑ کے وسیلے سے خدا سے چاہا کہ ان کی توبہ قبول ہو جائے اور خدا نے ان کی توبہ قبول فرمائی، یقیناً وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔''[۴]

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہی معنی کچھ اختلاف کے ساتھ مشہور تفسیر الدرّ المنثور میں جو کہ اہل سنّت کی تفسیر بالروایت ہے، نقل ہوئی ہے۔[۵]

ایک اور روایت میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی تفسیر سے نقل ہوا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام غلطی کا شکار

---

[۱] سورۂ اعراف، آیت ۲۳

[۲] بحار الانوار: جلد ۱۱، ص ۱۸۱

[۳] تفسیر نور الثقلین: ج ۱، ص ۶۸

[۴] کتاب خصال تفسیر نور الثقلین: جلد ۱، صفحہ ۶۰

[۵] تفسیر الدر المنثور: جلد ۱، ص ۶۰ سورۂ بقرہ: آیت ۳۷ کے ذیل میں۔

ہوئے اور خدا کی درگاہ سے معافی مانگی اور عرض کیا: پروردگارا، میری توبہ قبول کر اور میرا عذر مان کہ میں اس غلطی کے بُرے اثرات سے مکمل طور پر آگاہ ہو گیا ہوں، خدا نے فرمایا کیا تمہیں یاد نہیں ہے کہ میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ مشکلات وسختیوں اور خطرناک حادثوں میں محمدؐ اور اُن کی آلؑ کے وسیلے سے مجھے پکارو۔ آدمؑ نے عرض کیا، اے میرے خدا! ہاں، مجھے یاد ہے، خدا نے فرمایا وہ لوگ محمدؐ، علیؑ و فاطمہؑ وحسنؑ وحسینؑ ہیں، لہٰذا مجھے ان کے ناموں کے وسیلے سے پکارو تا کہ میں تمہاری درخواست منظور کروں اور تمہیں تمہاری خواہش سے بڑھ کر دوں۔ [1] ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ وہ کلمات درحقیقت مندرجہ ذیل دعا تھی:

"اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَعْلَمُ سِرِّیْ وَ عَلَانِیَتِیْ فَاقْبَلْ مَعْذِرَتِیْ وَ تَعْلَمُ حَاجَتِیْ فَاَعْطِنِیْ سُؤْلِیْ وَ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَسْاَلُكَ اِیْمَانًا یُبَاشِرُ قَلْبِیْ وَ یَقِیْنًا صَادِقًا حَتّٰی اَعْلَمَ اَنَّهٗ لَا یُصِیْبُنِیْ اِلَّا مَا كَتَبْتَ لِیْ وَارْضَنِیْ بِمَا قَسَمْتَ لِیْ" [2]

ان تمام روایات میں کوئی تضاد نہیں ہے، کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ حضرتِ آدمؑ نے پنجتن پاکؑ کے ناموں سے توسّل کرنے کے ساتھ مذکورہ دعائیں بھی پڑھی ہوں۔ بعض افراد نے مذکورہ مطالب کو حضرتِ آدمؑ کے معنوی و اندرونی حالات سے تعبیر کیا ہے۔ البتہ حضرت آدمؑ کا ان کلمات کو حاصل کرنے سے پہلے ان سے بے خبر ہونا حضرت آدمؑ کا تمام اسماء کے عالم ہونے سے منافات نہیں رکھتا، کیونکہ قوی احتمال یہ ہے کہ اسماء کے بارے میں جاننے سے مراد کائنات کی خلقت کے رازوں سے باخبر ہونا ہے، لیکن اپنی خودسازی اور غلطیوں کا ازالہ کرنا اور خدا کی طرف سیر وسلوک کرنا وغیرہ ایک الگ مرحلہ ہے۔

بارہواں حصّہ

وَ اصْطَفٰی سُبْحَانَهٗ مِنْ وَلَدِهٖٓ اَنْبِیَاءَ اَخَذَ عَلَی الْوَحْیِ مِیْثَاقَهُمْ وَ عَلَی تَبْلِیْغِ الرِّسَالَةِ اَمَانَتَهُمْ لَمَّا بَدَّلَ اَكْثَرُ خَلْقِهٖ عَهْدَ اللّٰهِ اِلَیْهِمْ فَجَهِلُوْا حَقَّهٗ وَ اتَّخَذُوا الْاَنْدَادَ مَعَهٗ وَ اجْتَالَتْهُمُ الشَّیَاطِیْنُ عَنْ مَعْرِفَتِهٖ وَ اقْتَطَعَتْهُمْ عَنْ عِبَادَتِهٖ فَبَعَثَ فِیْهِمْ رُسُلَهٗ وَ وَاتَرَ اِلَیْهِمْ اَنْبِیَاءَهٗ لِیَسْتَاْدُوْهُمْ مِیْثَاقَ فِطْرَتِهٖ وَ یُذَكِّرُوْهُمْ مَنْسِیَّ نِعْمَتِهٖ وَ یَحْتَجُّوْا عَلَیْهِمْ بِالتَّبْلِیْغِ وَ یُثِیْرُوْا لَهُمْ دَفَائِنَ الْعُقُوْلِ وَ یُرُوْهُمْ آیَاتِ الْمَقْدِرَةِ مِنْ سَقْفٍ فَوْقَهُمْ مَرْفُوْعٍ وَ مِهَادٍ تَحْتَهُمْ مَوْضُوْعٍ وَ مَعَایِشَ تُحْیِیْهِمْ وَ آجَالٍ

---

[1] شرح نہج البلاغہ مرحوم خوئی: جلد ۲ صفحہ ۱۱۸

[2] تفسیر الدر المنثور، جلد ۱، ص ۵۹

تُفْنِيْهِمْ وَ أَوْصَابٍ 53 تُهْرِمُهُمْ وَ أَحْدَاثٍ [تَتَتَابَعُ] تَتَابُعَ عَلَيْهِمْ وَ لَمْ يُخْلِ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ خَلْقَهُ مِنْ نَبِيٍّ مُرْسَلٍ أَوْ كِتَابٍ مُنْزَلٍ أَوْ حُجَّةٍ لَازِمَةٍ أَوْ مَحَجَّةٍ قَائِمَةٍ رُسُلٌ لَا تُقَصِّرُ بِهِمْ قِلَّةُ عَدَدِهِمْ وَ لَا كَثْرَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ لَهُمْ مِنْ سَابِقٍ سُمِّيَ لَهُ مَنْ بَعْدَهُ أَوْ غَابِرٍ عَرَّفَهُ مَنْ قَبْلَهُ عَلٰى ذٰلِكَ نَسَلَتِ الْقُرُوْنُ وَ مَضَتِ الدُّهُوْرُ وَ سَلَفَتِ الْآبَاءُ وَ خَلَفَتِ الْأَبْنَاءُ.

''اس کے بعد اُس نے ان کی اولاد میں سے اُن انبیاءؑ کا انتخاب کیا، جن سے وحی کی حفاظت اور پیغام کی تبلیغ کی امانت کا عہد لیا، اس لیے کہ آخری مخلوقات نے عہدِ الٰہی کو تبدیل کر دیا تھا؛ اُس کے حق سے ناواقف ہو گئے تھے؛ اُس کے ساتھ دوسرے خدا بنا لیے تھے اور شیطان نے انہیں معرفت کی راہ سے ہٹا کر عبادت سے یکسر جدا کر دیا تھا۔ پروردگار نے ان کے درمیان رسول بھیجے؛ انبیاءؑ کا تسلسل قائم کیا تا کہ وہ ان سے فطرت کی امانت کو واپس لیں اور انہیں بھولی ہوئی نعمت پروردگار کو یاد دلائیں؛ تبلیغ کے ذریعے ان پر اتمامِ حجت کریں اور ان کی عقل کے دفینوں کو باہر لائیں اور انہیں قدرت الٰہی کی نشانیاں دکھلائیں۔ یہ سروں پر بلند ترین چھت، یہ زیرِ قدم گہوارہ، یہ زندگی کے اسباب، یہ فنا کرنے والی اجل، یہ بوڑھا بنا دینے والے امراض اور یہ پے در پے پیش آنے والے حادثات۔ اُس نے کبھی اپنی مخلوقات کو نبی مرسل یا کتاب منزل یا حجت لازم یا طریق واضح سے محروم نہیں رکھا ہے۔ ایسے رسول بھیجے ہیں، جنہیں نہ عدد کی قلّت کام سے روک سکتی تھی اور نہ جھٹلانے والوں کی کثرت۔ ان میں جو پہلے تھا اسے بعد والے کا حال معلوم تھا اور جو بعد میں آیا اسے پہلے والے نے آگاہ کر دیا تھا اور یوں ہی صدیاں گزرتی رہیں اور زمانے بیتتے رہے۔ اور آباء و اجداد جاتے رہے اور اولاد و احفاد آتے رہے۔

شرح و تفسیر

پیغمبروں کی بعثت اور ان کی عظیم ترین ذمّے داریاں

مولا علیؑ کے اس کلام میں بعثتِ انبیاؑ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ دراصل حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت کے بعد دوسرا مرحلہ بعثتِ انبیاؑ کا ہے۔ اس حصّے میں آپؑ بعثتِ انبیاؑ کے بارے میں گفتگو فرماتے ہیں۔

پھر اُن کی دعوت کی کیفیت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں اور تیسرے مرحلے میں ان کی تعلیمات کے بارے میں گفتگو ہے اور آخر میں انبیاؑ کی خصوصیات، انھوں نے مشکلات کے مقابل کس طرح استقامت کا مظاہرہ کیا اور ان کا ایک دوسرے سے کیسا رابطہ تھا، اس پر گفتگو کی ہے۔

پہلے مرحلے میں فرماتے ہیں:

"وَ اصْطَفٰی سُبْحَانَهُ مِنْ وَلَدِهٖ اَنْبِيَاءَ اَخَذَ عَلَى الْوَحْيِ مِيْثَاقَهُمْ [۱] وَ عَلٰى تَبْلِيْغِ الرِّسَالَةِ اَمَانَتَهُمْ"

''خداوندِ سبحان نے اولادِ آدمؑ میں سے پیغمبروں کو چُنا اور اُن سے عہد لیا کہ وحیِ الٰہی کو محفوظ رکھیں گے اور رسالت جو ایک امانت ہے، لوگوں تک پہنچائیں گے۔''

اس بنا پر آغازِ وحی میں انھوں نے خدا سے عہد کیا کہ وحی کو امانت جانتے ہوئے بندگانِ خدا تک ابلاغ کریں گے اور انھوں نے اس عظیم عطا کے مقابل اس عظیم ذمّے داری کو قبول کیا۔ البتہ یہ کہ کس طرح خداوند عالم نے ایک خاص گروہ کو منتخب کیا اور وحی کی حقیقت کیا ہے، کس طرح بعض پر وحی ہوتی ہے، بعض پر نہیں ہوتی؟ اس طرح کے مسائل کو اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔ [۲]

"وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّإِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا" [۳]

''یاد کرو، جب پیغمبروں سے عہد لیا (اسی طرح) تم سے نوحؑ سے ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ بن مریمؑ، اور ہم نے ان سب سے عہد لیا کہ اس تبلیغ و رسالت کی ذمّے داریوں میں کوتاہی نہ کرنا۔''

پھر بعثتِ انبیاءؑ کی اصل دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لَمَّا بَدَّلَ اَكْثَرُ خَلْقِهٖ عَهْدَ اللّٰهِ اِلَيْهِمْ فَجَهِلُوْا حَقَّهٗ، وَ اتَّخَذُوْا الْاَنْدَادَ [۴] مَعَهٗ، وَ اجْتَبَالَتْهُمْ [۵] الشَّيَاطِيْنُ عَنْ مَعْرِفَتِهٖ، وَ اقْتَطَعَتْهُمْ عَنْ عِبَادَتِهٖ"

---

[۱] بنا بر صحاح اللغۃ میثاق مادّہ وثوق سے بمعنی اعتماد اور اطمینان ہے، جو کسی پر اُس کی امانت داری کی وجہ سے کیا جائے۔ (اصل میں موثاق تھا واؤ یاء میں بدل گیا)۔

[۲] تفسیر موضوعی (پیامِ قرآن) کی طرف رجوع کریں جلد ۷، ص ۳۱۷

[۳] سورۂ احزاب، آیت ۷

[۴] ''انداد'' جمع ''ندّ'' بروزن ضد، بمعنی مثل ہے، لیکن اصل مادّہ جیسا کہ مقائیس اور دوسرے کہتے ہیں بہ معنی جدا کرنا، فرار کرنا کے ہیں۔ اہل لغت کہتے ہیں ''ندّ'' ہر طرح کی مثل کو نہیں کہتے بلکہ اسے کہتے ہیں جو آثار اور اعمال میں راہِ مخالفت کو اختیار کرے۔ جس طرح انسان دوسرے انسان کی مثل ہے لیکن اُس کے ساتھ حالتِ جنگ میں نہیں ہے۔

[۵] اجتال، جولان سے ہے دوران کے معنی میں۔ امام علیؑ کے کلام میں ''عن'' کے ساتھ ذکر ہوا ہے، جس کا مفہوم جولان دینا اور کسی چیز کو واپس پلٹانا ہے۔ ممکن ہے یہ معنی و مفہوم ہو کہ ہر زمانے میں ان کو اس سے دور لے جائے۔

''یہ اُس وقت ہوا جب خدا نے اکثر لوگوں سے عہد لیا، مگر وہ پھر گئے اور اُس کے حق کو نہیں پہچانا اور اُس کے شریک کے قائل ہو گئے، شیطانوں نے انھیں معرفتِ خدا سے دور رکھا۔ انھیں ہر طرف کھینچا اور عبادت و اطاعت سے دور رکھا۔''

حقیقت میں خدا کی عدم شناخت سبب بنی، جو شرک کے ہولناک درجے میں گرے اور شیطانوں نے انھیں گھیر لیا۔ اور اطاعت اور عبادت خدا سے انھیں روکا۔ وعدہ اور عہدِ الٰہی سے مقصود کیا ہے؟ نہج البلاغہ کے بہت سے شارحین نے عالم ذر کی طرف اشارہ کیا کہ ممکن ہے وہاں خدا نے وعدہ لیا ہو۔ وعدۂ فطرت ہو، کیونکہ امام علیہ السلام بعد کے جملوں میں اس حوالے سے گفتگو فرماتے ہیں۔[۱] ایک دوسری تعبیر کے مطابق خداوند عالم نے انسان کو پاک فطرت پر خلق کیا اور اندرونی طور پر حقیقتِ توحید سے آشنا کیا ہے۔ لہٰذا یہ نیکیوں سے محبت اور برائیوں سے نفرت رکھتا ہے۔ اگر یہ پاک فطرت باقی رہ جائے تو خدا کے کتنے الطاف و عنایات ہیں، جو اس پر ظاہر ہوں اور وہ کمال کی طرف گامزن ہو۔ انبیاؑ اس کے مددگار رہوں اور اس کی ذمّے داریوں کا وزن ہلکا ہو جائے۔

لیکن فطرت سے انحراف چاہے عقیدۂ توحید میں ہو، جس کا نتیجہ شرک و بت پرستی ہے، چاہے عملی اعتبار سے ہو، جس کا نتیجہ اپنے آپ کو ہوا و ہوس کے سپرد کر دینا ہے اور شیاطین کے حوالے کر دینا ہے، یہی سبب بنا کہ خدا نے بہت سے انبیاؑ کو بہت اہم ذمّے داریاں دے کر معاشرے میں بھیجا، دوسرے حصّے میں امامؑ نے ان کی اَخلاقی و عملی خصوصیات کے بارے میں اشارہ کیا ہے۔

پھر بعثتِ انبیاؑ کے فلسفے کی طرف اشارہ فرمایا:

''فَبَعَثَ فِيهِمْ رُسُلَهُ وَ وَاتَرَ اِلَيْهِمْ[۲] اَنْبِيَاءَهُ لِيَسْتَأْدُوهُمْ مِيثَاقَ فِطْرَتِهِ، وَ يُذَكِّرُوهُمْ مَنْسِيَّ نِعْمَتِهِ، وَ يَحْتَجُّوا عَلَيْهِمْ بِالتَّبْلِيغِ، وَ يُثِيرُوا لَهُمْ دَفَائِنَ الْعُقُولِ''

''خداوند عالم نے انسانوں کے درمیان انبیاؑ مبعوث فرمائے اور رسولوں کو ایک کے بعد ایک بھیجا تا کہ وہ فطرت کے وعدے کا ان سے مطالبہ کریں اور خدا کی وہ نعمتیں جن کو بھلا دیا ہے، یاد دلائیں۔ خدا کے احکامات کو ان تک پہنچا کر اتمامِ حجت کریں اور عقلوں کے پوشیدہ خزانے ان کے لیے آشکار کریں۔''

---

[۱] عالمِ ذر سے متعلق گفتگو میں یہ احتمال ممکن ہے، اس کی تفسیر میں وہی مسائلِ فطری اور وہی استعداد مراد ہو، جو خدا نے دی ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے تفسیر نمونہ، جلد ۷، ص ۴ پر رجوع کریں۔

[۲] ''واتر'' مادّہ ''وتر'' سے ہے بمعنی فرد جو مقابل شفع (زوج) کے ہے۔ یہاں واحد کے معنی میں آیا ہے یعنی پیغمبرؑ ایک کے بعد ایک ہدایت کے لیے آئے، بعض کہتے ہیں ایک کے پیچھے ایک فاصلے کے ساتھ آئے۔ (واترما علیه من الصّوم) یعنی ایک دن روزہ رکھا ایک دن افطار کیا۔ یہ متدارک کے مقابل ہے، یعنی بغیر فاصلے کے ایک کے پیچھے ایک کا آنا۔

یہاں امامؑ نے انبیاءؑ کے بعثت کے پانچ اہم ترین اہداف کی طرف اشارہ کیا ہے:

پہلا: فطری عہد و پیمان کا مطالبہ ہے۔ خداوند متعال نے توحید کے عقیدے کو انسان کی فطرت میں قرار دیا۔ اگر انسان اس فطرت کو ضائع نہ کرے اور اس سالم فطرت کے ساتھ پرورش پائے اور غلط تربیت اس کو منحرف نہ کرے، مشرک والدین اس کی روح کو آلودہ نہ کریں تو یہ انسان فطرتاً توحید پرست رہے گا اور اس فطرت کے سائے میں حق و عدالت کا پابند رہے گا، گویا اس لیے پیغمبر آتے ہیں کہ وہ افراد جو منحرف ہیں، ان کو فطرتِ توحید کی طرف پلٹائیں۔

دوسرا: وہ نعمتیں جن کو بھلا دیا ہے، یاد دلائیں۔ انسان کے وجود میں مادّی اور معنوی نعمتیں بہت ہیں۔ اگر ان سے صحیح فائدہ اٹھائیں تو یہ انسان سعادت و خوش بختی کے محل ان کی بنیاد پر استوار کر سکتا ہے لیکن ان نعمتوں کا بھلا دینا سبب بنتا ہے کہ ان نعمتوں سے محروم ہو جائے۔ بالکل اسی طرح، جس طرح ایک باغبان صحیح وقت پر پانی نہ دینے کی وجہ سے صحیح موقع پر پھل نہیں اتار سکتا، لہٰذا جب کوئی آ کر اس نعمت کو یاد دلائے جو وہ بھلا بیٹھا ہے تو اس نے اس کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ گویا وہ کام انبیاءؑ نے کیا۔

تیسرا: عقلی استدلال کے ذریعے حجّت تمام کریں اور آسمانی تعلیمات اور ارشاداتِ الٰہی کو انسانوں تک پہنچائیں۔

چوتھا: علمی خزانوں کو جو عقلِ انسان میں رکھے ہوئے ہیں، انھیں ظاہر و آشکار کرنا، کیوں کہ اللہ نے عظیم اور قیمتی خزانے انسان کی عقل میں قرار دیے ہیں، اگر وہ ظاہر ہوں تو علوم اور معرفت میں ایک خاص ترقی ہو گی لیکن غفلت اور غلط تعلیمات اور گناہوں کی آلودگی ان پر پردہ ڈال دیتی ہے اور ان کو چھپا دیتی ہے۔ پیغمبرؐ اِن پردوں کو ہٹاتے ہیں اور اُس خزانوں کو آشکار کرتے ہیں۔

پانچواں:

"وَيُرُوهُمْ آيَاتِ الْمَقْدِرَةِ"

''خدا کی قدرت کی نشانیوں کو ان کے سامنے بیان کریں۔''

پھر امامؑ ان آیات (نشانیوں) کی تفسیر کرتے ہیں:

"مِنْ سَقْفٍ فَوْقَهُمْ مَرْفُوعٍ، وَمِهَادٍ تَحْتَهُمْ مَوْضُوعٍ، وَ مَعَايِشَ تُحْيِيهِمْ، وَآجَالٍ تُفْنِيهِمْ،

وَاَوْصَابٍ[۱] تُهَرِّمُهُمْ،[۲] وَاَحْدَاثٍ تَتَابَعُ عَلَيْهِمْ"

''آسمان کی چھت جوان کے اُوپر ہے، یہ زمین کا گہوارہ جوان کے پیروں کے نیچے ہے، اور وہ وسائلِ زندگی جن سے اُن کی حیات وابستہ ہے، وہ آخری لمحۂ حیات اور اجل جو انھیں ختم کردے گی، وہ مشکلات اور پریشانیاں جو بوڑھا کردیتی ہیں اور وہ پے در پے آنے والے حادثات جن کا انہیں سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ یہ امور یعنی اسرارِ خلقت، آسمان وزمین، وسائل واسباب زندگی اور اسی طرح وہ عوامل جو موت، درد والم کا باعث ہیں، انسان کو خدا کی یاد دلاتے ہیں۔ اسی طرح وہ مختلف حوادث جو عبرت اور انسان کی بیداری کا سبب ہیں، ان کے ذریعے معرفت کی سطح بلند ہوتی ہے اور اُس کی بیداری وآگاہی میں اضافہ ہوتا ہے یا وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوتا ہے۔

"وَلَمْ يُخْلِ اللهُ سُبْحَانَهُ خَلْقَهُ مِنْ نَبِيٍّ مُرْسَلٍ، اَوْ كِتَابٍ مُنْزَلٍ، اَوْ حُجَّةٍ لَازِمَةٍ، اَوْ مَحَجَّةٍ قَائِمَةٍ"

''خداوند سبحان نے کبھی انسانی معاشرے کو رسولؐ وپیغمبرؑ، کتابِ آسمانی، دلیلِ قاطع اور روشن راستے سے خالی نہیں چھوڑا۔''

درحقیقت یہ عبارت چار موضوعات کی طرف اشارہ کررہی ہے۔ ان میں سے ایک یا کچھ خلقِ خدا میں موجود ہیں اور اس طرح سے اتمامِ حجت ہورہا ہے:

پہلا: انبیائے کرامؑ کا ہونا چاہے۔ آسمانی کتاب ان کے ہمراہ ہو یا نہ ہو، کیونکہ نبی کا وجود ہر حالت میں ہدایت و بیداری اور اتمامِ حجّت کا سبب ہے۔

دوسرا: آسمانی کتابیں ہیں، جو مختلف امّتوں کے پاس موجود ہیں، چاہے ان کے لانے والے اس دنیا سے چلے گئے ہوں۔

تیسرا: امام اور اوصیاء جو معصوم اوصیاء ہیں، جن کو ''حجتِ لازمہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے، لیکن بعض نے احتمال دیا ہے کہ اس سے مراد دلیل عقلی ہے، جبکہ عقلی دلیل تنہا ہدایت کے لیے کافی نہیں، اس لیے یہ احتمال بہت بعید ہے، لیکن اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ دونوں مفہوم اس عبارت میں جمع ہوگئے ہوں۔

چوتھا: سنتِ انبیاءؑ وائمہؑ اور اوصیاءؑ ہے جسے "مَحَجَّةٍ قَائِمَةٍ" کہا گیا ہے۔ "مَحَجَّةٍ" لغت میں واضح اور سیدھے

---

[۱] اوصاب مادّۂ وصب سے ہے۔ مفردات کے بقول دائمی بیماری مراد ہے یعنی واصب، ہر وہ چیز جو دائمی ہو، اُس پر اطلاق ہوتا ہے امامؑ کے کلام میں بھی مشکلات وغم جو ہمیشہ ہوں، کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

[۲] تهرمهم، "هرم" کے مادّے سے ہے، (بروزنِ حرم)، یعنی ایسی ضعیفی جو بالکل کام کرنے سے معذور کردے۔

راستے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چاہے وہ ظاہری ہو یا معنوی، وہ راہ جو انسان کو اس کے مقصود تک پہنچا دے۔[۱]

اس طرح خدا نے تمام امّتوں، قوموں اور تمام زمانوں کے لیے اتمامِ حجت کیا ہے اور اسبابِ ہدایت عطا فرمانے میں کوئی کمی نہیں رکھی۔ پھر انبیائے کرامؑ کی خصوصیات کو بیان فرماتے ہیں:

"رُسُلٌ لَا تُقَصِّرُ بِهِمْ قِلَّةُ عَدَدِهِمْ، وَلَا كَثْرَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ لَهُمْ"

''پیغمبروں کو افراد کی کمی اور دشمنوں کی زیادتی، جھٹلانے والوں کی موجودگی نے اپنی ذمے داریوں کو پورا کرنے سے نہیں روکا۔''

ہاں وہ بلند حوصلہ انسان تھے جو اکیلے ہزار ہزار افراد کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ آگ کے دریا میں جا کر بھی اللہ کی تائید سے سالم نکل آتے۔ بت خانوں کو نابود کرنے اور بت پرستوں کے غیظ و غضب کے سامنے دلائلِ قاطع کے ساتھ کھڑے رہتے، ان کو شرمسار کرتے، دریا میں جاتے اور دوسری سمت سے باہر نکل آتے، کبھی ایسے دشمنوں کے باوجود، جو برہنہ تلواروں کے ساتھ ان کا محاصرہ کر لیتے، ان کے چہرے پر شکن بھی نہ آتی۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ پیغمبروں کی معرفت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"مِنْ سَابِقٍ سُمِّيَ لَهُ مَنْ بَعْدَهُ، أَوْ غَابِرٍ[۲] عَرَّفَهُ مَنْ قَبْلَهُ"

''بعض پیغمبروں کی بشارت دی گئی یا دوسرے پیغمبروں کے ذریعے ان کی شناخت کروائی گئی۔''

اس عبارت میں انبیاؑ کی شناخت کی اہم ترین روش کو بتایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ گزشتہ نبی نے آنے والے نبی کا تعارف کرایا اور بعد میں آنے والوں نے پچھلوں کی تصدیق کی۔

آخر میں فرماتے ہیں:

"عَلٰى ذٰلِكَ نَسَلَتِ[۳] الْقُرُوْنُ، وَمَضَتِ الدُّهُوْرُ، وَسَلَفَتِ الْاٰبَاءُ، وَخَلَفَتِ الْاَبْنَاءُ"

''صدیاں گزر گئیں، زمانے بیت گئے، آباء و اجداد اس دنیا سے چلے گئے، ان کی اولادیں ان کی جانشین بن گئیں۔''

---

[۱] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم مادّہ حج۔ (۲) غابر کا مادّہ غبار اور غبور سے ہے یعنی ہر وہ چیز جو باقی بچ جائے۔ لہٰذا پستان میں باقی ماندہ دودھ کو غیرۃ کہتے ہیں۔ فضا میں موجود خاک کو غبار کہتے ہیں۔

[۲] گزرے ہوئے زمانے اور افراد کو غابر کہتے ہیں (مقائیس، مفردات، لسان العرب)

[۳] نسلت القرون میں مادّے، نسل یعنی افزائش نسل یہ کنایہ ہے، اس سے کہ قرن ایک کے پیچھے ایک آ رہے ہیں ہر قرن دوسرے قرن سے پیدا ہوتا ہے جیسے فرزند و پدر ہوتے ہیں۔

نکات

۱۔ پیغمبرؑ باغبان کی مانند ہیں

ایک خوبصورت تعبیر جو اس کلامِ امامؑ میں بیان ہوئی ہے کہ خداوند عالم نے تمام نیکیوں اور خوش بختیوں کی استعداد انسان میں رکھی ہے، گویا اس کے وجود میں قیمتی وگراں بہا معدن وخزانے رکھے ہیں۔ اس کے اندر مختلف انواع کے معطر پھول اور پھل، مختلف فضائل کی صورت میں قرار دیے ہیں۔ انبیائے کرامؑ جو عظیم باغبان ہیں، ان بیجوں کو پانی دیتے ہیں اور ان کی پرورش کرتے ہیں اور یہ آسمانی معدن شناس اس کے وجود کے خزانے سے صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہیں اور بعد والے انبیاءؑ اُن کے ذریعے آگاہ کیے گئے۔[۱]

"لِيَسْتَأْدُوهُمْ مِيثَاقَ فِطْرَتِهِ وَيُذَكِّرُوهُمْ مَنْسِيَّ نِعْمَتِهِ.. وَيُثِيرُوا لَهُمْ دَفَائِنَ الْعُقُولِ"

''اور انسان اس جوہر کے خزانوں سے جو اس کے وجود کو آشکار کرتا ہے اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کی نعمت جو ان کے اندر چھپی ہوئی ہے، کی قدر و قیمت سے غافل ہے۔''

انبیاءؑ انہی چیزوں کی یاد دہانی کراتے ہیں۔ اس بنا پر نبی انسان کو وہ چیز نہیں دیتے جو اس میں نہیں ہے بلکہ جو چیز اس کے اندر موجود ہے، اُس کی پرورش کرتے ہیں اور اس کے گوہر کو آشکار کرتے ہیں۔ بقول شاعر ؎

گوہر خود را ھویدا کن　　کمال اینست و بس

''اپنے اندر چھپے ہوئے گنجینہ کو ظاہر کر یہی کمال ہے۔''

خویش را در خویش پیدا کن　　کمال اینست و بس

''خود کو اپنی ذات کے اندر (خودی کو خودی میں) تلاش کر، یہی کمال ہے۔''

بعض معتقد ہیں کہ وہ تمام تعلیمات جو انسان کو دی جاتی ہیں، وہ سب یاد دہانی کی خاطر ہیں، کیوں کہ تمام علوم کی جڑیں انسان کے اندر پوشیدہ ہیں اور معلمِ انسان یعنی انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کے پیروکار اپنی تعلیمات سے انسان کے اندر موجود علمی صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہیں، گویا تمام علوم زیر زمین پانی کے خزانوں کی طرح ہیں، جنہیں زمین کھود کر یا بواور رنگ کے ذریعے شناخت کر کے سطح زمین پر لایا جاتا ہے۔ قرآنی آیات میں "تَذَكُّر" کی مثال:

---

[۱] بعض نسخوں میں مسمی مجہول لکھا گیا، یہ عبارت اس نسخے کے مطابق ہے جہاں فعل معلوم ہو۔

"لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ...وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ"

علوم پانی کے چشموں کی طرح انسان کے اندر موجود ہیں اور اسے یاد دہانی کے ذریعے ظاہر وعیاں کیا جاتا ہے۔ یہ مذکورہ مطلب کے لیے ایک شاہد کی حیثیت رکھتا ہے، اس بارے میں گفتگو بہت طویل ہے، لیکن یہ اس کے بیان کا محل نہیں۔

۲۔ وہ حادثات جو بیدار کرتے ہیں

مندرجہ بالا کلام میں اس طرف اشارہ ہوا ہے کہ انبیاؑ تعلیم وتربیت کے علاوہ اس عالم میں انسان کا مقام، اُس کو ان حادثات کی جانب جو اُس کی بیداری کا سبب بنتے ہیں متوجہ کرتے ہیں۔ زندگی کا اختتام مادّی نعمتوں کی فنا، رنج وغم، عبرت انگیز حادثات، یہ تعبیریں دردناک حادثات کے فلسفے کو انسانی زندگی میں آشکار کرتی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو انسان اُس خوابِ غفلت میں رہتا، جس سے بیدار ہونا مشکل ہوتا۔ [1]

۳۔ انسانی زندگی میں دِین کا کردار

امامؑ اس حصّے میں بہت پُرمعنی انداز میں انسانی زندگی میں دین کا کردار بیان کرتے ہیں اور آپؑ نے بتایا کہ اگر انبیائے کرامؑ نہ ہوتے تو یہ دنیا شرک وبت پرستی سے بھری رہتی، شیاطین انسان کو خدا کی معرفت اور اُس کی بندگی سے دور رکھتے، کیونکہ انسان کی عقل اسباب سعادت کی پہچان کے لیے کافی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عقل نور ہے لیکن جب آفتابِ وحی اس پر نورافشانی نہ کرے تو صرف عقل اس خطرناک وادی کو طے نہیں کرسکتی اور اس کے نشیب وفراز سے نہیں گزر سکتی۔

یہاں پر واضح ہوتا ہے کہ ''برہمن'' جو بعثتِ انبیاءؑ کے منکر ہیں، سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں، کیونکہ اگر انسانی عقل تمام ظاہری وباطنی اَسرار کا ادارک کرسکتی تو گزشتہ، حال اور مستقبل کے رابطے کو جان سکتی اور تشخیص میں غلط فہمی کا شکار نہ ہوتی۔ ممکن ہے کہا جائے عقل کا ادراک تمام مشکلاتِ زندگی اور اِس جہان واُس جہان کے مسائل کو درک کرنے میں کافی ہے مگر عقلی ادراکات کا محدود ہونا اور مجہولات کا معلومات سے زیادہ ہونا واضح کرتا ہے کہ عقل پر بھروسا کرنا کافی نہیں۔ اس کا انکار نہیں کہ عقل حجتِ الٰہی ہے۔ اور اسی خطبے میں امامؑ نے اشارہ فرمایا ہے کہ اسلامی روایات اسے پیغمبرِ باطنی کا عنوان دیتی ہیں۔

معروف حدیث جو حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے منقول ہے:

"اِنَّ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حُجَّتَيْنِ حُجَّةً ظَاهِرَةً وَ حُجَّةً بَاطِنَةً فَاَمَّا الظَّاهِرُ فَالرُّسُلُ وَ الْاَنْبِيَاءُ وَ

---

[1] اس کی مزید تشریح پیامِ قرآن، ج ۴، ص ۴۴۰ کے بعد موجود ہے۔

الْاَئِمَّةُ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ وَاَمَّا الْبَاطِنَةُ فَالْعُقُوْلُ"

''خدا کی طرف سے لوگوں پر دو حجّتیں ہیں: ایک ظاہری حجّت، دوسری باطنی حجّت؛ ظاہری حجّت پیغمبر، رسولؐ وائمہ ؑ اور جبکہ باطنی حجت عقل ہے۔''[1]

لیکن واضح رہے کہ باطنی رسول (حجت) کی قوت محدود ہے، جبکہ ظاہری رسول جس نے وحی پر تکیہ کیا ہوا ہے، یہ وحی منبعِ علمِ خدا ہے اور اس کی قوت لامحدود ہے۔ یہاں پر برہمن فلسفیوں کے جواب سے روشن ہے کہ وہ کہتے ہیں پیغمبرؑ جو ہمارے لیے لائے وہ دو صورتوں سے خارج نہیں یا تو ہماری عقل اسے درک کرتی ہے یا نہیں کرتی۔ اگر ہماری عقل درک کرتی ہے تو پیغمبروں کی ضرورت نہیں۔ اگر درک نہیں کرتی یعنی وہ غیر معقول ہے تو بات قابل قبول نہیں، کیوں کہ کوئی بھی انسان غیر معقول باتوں کو نہیں مان سکتا۔

اس استدلال پر جو اعتراض ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے غیر معقول اور مجہول کے درمیان فرق نہیں رکھا۔ ان کا تصوّر ہے کہ عقل تمام چیزوں کو درک کرتی ہے، جب کہ یہاں تین قسم کی تقسیم ہے۔ جو باتیں ہمارے سامنے ہیں وہ یا عقل کے حکم کے مطابق ہیں یا مخالف یا مجہول ہیں۔ اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اکثر مطالب کا تعلق تیسری قسم یعنی مجہول سے ہے، پیغمبروںؑ کی کوشش اسی حصّے کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ ہم اپنے عقلی ادراکات میں وسوسے کا شکار ہو جاتے ہیں کہ ایسا نہ ہو ہم غلطی پر ہوں۔ یہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تائید ضروری ہے، گویا عقل نقل کے ساتھ مل کر ہمیں مطمئن کر سکتی ہے تا کہ جس راہ پر چل رہے ہیں، اس پر اطمینان حاصل ہو سکے۔

۴۔ ہر زمانے میں حجّت خدا کا ہونا ضروری ہے

مولا علی علیہ السلام کی تعبیرات میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے، جس پر آپ تاکید بھی فرماتے ہیں کہ خدا نے اپنی مخلوق کو حجت و رہنما کے بغیر نہیں چھوڑا۔ اب وہ حجت نبیؐ ہو، کتابِ آسمانی یا امامِ معصومؑ اور اُن کی سنّت و سیرت ہو، اہم بات یہ ہے کہ امامؑ کے کلام میں کتابِ آسمانی اور پیغمبر، ایک ساتھ اور حجتِ الٰہی اور سیرۂ معتبر ایک ساتھ بیان ہُوئے ہیں۔ ہاں ہر آسمانی کتاب کے ساتھ ایک پیغمبر ہو جو کتاب کو واضح کرے اور اسے عملی صورت دے۔ نبیؐ کی جاری سنّت کے ساتھ وصیؑ یا امامؑ ہو تا ہے جو کہ نبیؐ کی میراث کی حفاظت کرے اور اس کے نفاذ کے لیے کوشش کرے۔ یہ وہ ہی ہے جس پر ہمارا اعتقاد ہے۔

حضرت امامِ صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[1] اصول کافی، ج۱، ص۱۶

"لَوْ لَمْ يَبْقَ فِي الْاَرْضِ اِلَّا اِثْنَانِ لَكَانَ اَحَدُهُمَا الْحُجَّةَ"

''اگر زمین پر صرف دو افراد باقی رہ جائیں تو ان میں سے ایک حجّتِ خدا اور امامؑ ہے۔''[۱]

امام علیہ السلام کلماتِ قصار میں فرماتے ہیں:

"اَللّٰهُمَّ بَلٰى لَا تَخْلُوا الْاَرْضُ مِنْ قَائِمٍ لِلّٰهِ بِحُجَّةٍ اِمَّا ظَاهِرًا مَشْهُوْرًا وَ اِمَّا خَائِفًا مَغْمُوْرًا لِئَلَّا تَبْطُلَ حُجَجُ اللّٰهِ وَبَيِّنَاتُهُ"[۲]

''ہاں! مگر زمین ایسے فرد سے خالی نہیں رہتی کہ جو خدا کی حجّت کو برقرار رکھے، چاہے وہ ظاہر و مشہود ہو یا خائف و پنہاں، تا کہ اللہ کی دلیلیں اور نشان مٹنے نہ پائیں۔''

۵۔ پیغمبروں کی خصوصیات

انبیائے کرامؑ جو خدا کی جانب سے لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے، وہ عام انسان نہیں تھے، بلکہ وہ تمام صفات جو ان کی رسالت کے لیے ضروری تھیں، ان میں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک شہامت و بردباری جو تبلیغ کے لیے بہت ضروری ہے، ایسے افراد کے سامنے شہامت و بردباری جو جاہل، ضدی اور سخت دل ہوتے ہیں اور شہامت کا نہ ہونا تبلیغ کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے یہاں تک کہ شہادت تک بردباری و شہامت کا مظاہرہ کرنا، یہ وہی صفت ہے جس کی طرف آپؑ نے گزشتہ باب میں اشارہ فرمایا ہے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ شہامت کی وجہ سے اچھے افراد کی کمی، دشمنوں اور جھٹلانے والوں کی کثرت رسالت کی انجام دہی میں مانع نہیں ہوتی۔ جب بھی انبیاءؑ (خصوصاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو مولاؑ کے اس قول کی سچائی اور زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آجاتی ہے۔

قرآن مجید میں یہ صفت رسالت کی خصوصیات میں سے شمار کی گئی ہے:

"اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسَالَاتِ اللّٰهِ وَ يَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ"[۳]

''وہ لوگ اللہ کے پیغامات پہنچاتے تھے اور اس کا خوف رکھتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔''

---

[۱] اصول کافی، ج ۱، ص ۱۷۹

[۲] نہج البلاغہ کلماتِ قصار ۱۴۷

[۳] سورۂ احزاب، آیت ۳۹

''منہاج البراعۃ'' کے مؤلف لکھتے ہیں، اس بارے میں امامؑ کی گفتگو واضح وروشن ہے کہ انبیائے کرامؑ کے لیے تقیہ جائز نہیں ہے۔ فخر الدین رازی شیعہ امامیہ کی طرف ایک بے بنیاد تہمت کی نسبت دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں: ''شیعہ مقام تقیہ میں انبیاؑ سے اظہارِ کفر کو جائز سمجھتے ہیں۔''، یہ جھوٹ اور باطل ہے۔ [۱]

بلکہ بات اس سے بالاتر ہے کہ تقیہ کرنا اماموں کے لیے حتیٰ کہ عام افراد کے لیے جہاں دین کی اَساس خطرے میں ہو، حرام ہے۔ گویا تقیہ کبھی واجب ہے تو کبھی حرام۔ اگر تقیہ نہ کرے تو جسمی نقصان اور جان کو خطرہ ہو تو تقیہ واجب ہے مثلاً اگر دشمنوں کے چنگل میں کوئی مسلمان پھنس جائے اور اظہارِ اسلام کی وجہ سے قتل کر دیا جائے گا اور مسلمانوں کو نقصان ہوگا تو یہاں ضروری ہے کہ وہ اپنے ایمان وعقیدے کو چھپائیں اور اگر عقیدہ چھپانے کی وجہ سے ذلت ورسوائی ہو تو واجب ہے شجاعانہ انداز سے اظہارِ اسلام کرے۔ اس باب میں امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب بہترین مثال ہیں۔ انبیائے کرامؑ اگر اپنے عقیدے کو مخفی رکھیں تو ان کی رسالت پر حرف آتا ہے لہٰذا ان کے لیے تقیہ ترک کرنا ضروری ہے۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ تقیہ صرف شیعہ یا دیگر مسلمانوں کا مسئلہ نہیں بلکہ اہلِ عقل کا بنیادی اصول ہے کہ جہاں اظہارِ عقیدہ بغیر کسی فائدے کے جسمانی نقصان کا باعث ہو، وہاں اظہارِ عقیدہ نہ کیا جائے۔ [۲]

تیرہواں حصّہ

إِلَى أَنْ بَعَثَ اللهُ سُبْحَانَهُ مُحَمَّداً [صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم] رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لِإِنْجَازِ عِدَتِهِ وَ إِتْمَامِ نُبُوَّتِهِ مَأْخُوْذًا عَلَى النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقُهُ مَشْهُوْرَةً سِمَاتُهُ كَرِيْمًا مِيْلَادُهُ وَ أَهْلُ الْأَرْضِ يَوْمَئِذٍ مِلَلٌ مُتَفَرِّقَةٌ وَ أَهْوَاءٌ مُنْتَشِرَةٌ وَ طَرَائِقُ مُتَشَتِّتَةٌ بَيْنَ مُشَبِّهٍ لِلّٰهِ بِخَلْقِهِ أَوْ مُلْحِدٍ فِي اسْمِهِ أَوْ مُشِيْرٍ إِلَى غَيْرِهِ فَهَدَاهُمْ بِهِ مِنَ الضَّلَالَةِ وَ أَنْقَذَهُمْ بِمَكَانِهِ مِنَ الْجَهَالَةِ ثُمَّ اخْتَارَ سُبْحَانَهُ لِمُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لِقَاءَهُ وَ رَضِيَ لَهُ مَا عِنْدَهُ وَ أَكْرَمَهُ عَنْ دَارِ الدُّنْيَا وَ رَغِبَ بِهِ عَنْ مَقَامِ الْبَلْوَى فَقَبَضَهُ إِلَيْهِ كَرِيْمًا وَ خَلَّفَ فِيْكُمْ مَا خَلَّفَتِ الْأَنْبِيَاءُ فِي أُمَمِهَا إِذْ لَمْ يَتْرُكُوهُمْ هَمَلًا بِغَيْرِ طَرِيْقٍ وَاضِحٍ وَ لَا عَلَمٍ قَائِمٍ۔

''یہاں تک کہ مالک نے اپنے وعدے کو پورا کرنے اور اپنی نبوت کو مکمل کرنے کے لیے آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیج دیا، جن کے بارے میں انبیاؑ سے عہد لیا جا چکا تھا اور جن کی علامتیں مشہور اور ولادت مسعود ومبارک

---

[۱] منہاج البراعۃ جلد ۲، ص ۶۰

[۲] تقیہ کے بارے میں وضاحت اور اس کے احکامِ خمسہ میں تقسیم (واجب، حرام، مستحب، مکروہ، مباح) اور اس سے مربوط آیات وروایات ملاحظہ کریں، کتاب قواعد فقہیہ، ج ۱، ص ۳۸۳۔

تھی۔اُس وقت اہلِ زمین متفرق مذاہب، منتشر خواہشات اور مختلف راستوں پر گامزن تھے۔کوئی خدا کو مخلوقات کی شبیہ بتا رہا تھا۔کوئی اس کے ناموں کو بگاڑ رہا تھا۔اور کوئی دوسرے خدا کا اشارہ دے رہا تھا۔مالک نے آپؐ کے ذریعے سب کو گمراہی سے ہدایت دی اور جہالت سے باہر نکال لیا۔

پھر اللہ سبحانہٗ نے آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے لقاو قرب کے لیے چُنا۔اپنے خاص انعامات آپؐ کے لیے پسند فرمائے اور دارِ دنیا کی بود و باش سے آپؐ کو بلند تر سمجھا اور زحمتوں سے گھری ہوئی جگہ سے آپؐ کے رخِ انور کو موڑا اور دنیا سے باعزت آپؐ کو اٹھا لیا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم میں اسی طرح کی چیز چھوڑ گئے، جو انبیاءؑ اپنی امتوں میں چھوڑتے چلے آئے تھے۔اس لیے کہ وہ طریق واضح اور نشانِ محکم قائم کیے بغیر یوں ہی بے قید و بند انہیں نہیں چھوڑتے تھے۔''

شرح وتفسیر

ظہورِ اسلام

خطبے کے اس حصّے میں حضرت امام علیؑ چار چیزوں کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

اوّل: بعثتِ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؐ کے فضائل و خصوصیات اور نبوّت کی علامتیں۔

دوّم: آپؐ کے زمانے میں دُنیا کے حالات، دینی اور عقیدتی گمراہیاں اور ان گمراہیوں کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی گھٹا ٹوپ تاریکیوں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے نجات۔

سوّم: دارِ دنیا سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت۔

چہارم: آپؐ کی میراث یعنی قرآن مجید۔

پہلے حصّے میں فرماتے ہیں:

''اِلٰی اَنْ بَعَثَ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ مُحَمَّدًا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ لِاِنْجَازِ [1] عِدَتِهِ وَ اِتْمَامِ نُبُوَّتِهِ [2]''

---

[1] اِنجاز، کا مادّہ نَجَزَ ہے اور اختتام اور متحقق کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے۔

[2] ''نبوتہٖ'' کی ضمیر پیغمبرؐ کی طرف پلٹتی ہے۔لیکن ''عدتہٖ'' کی ضمیر دو معنی رکھتی ہے، ایک یہ کہ خدا کی طرف ہے، دوسرے یہ کہ رسولؐ کی طرف ہے۔البتہ پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے کیونکہ بعثت نبیؐ، خدا کا وہ وعدہ تھا جو حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیائے کرامؑ سے کیا تھا۔یہ احتمال بھی ہے کہ دونوں ضمیریں خدا کی طرف پلٹیں۔

''(حالات اسی طرح رہے) یہاں تک کہ خدا نے اپنے عہد اور نبوت کو کامل کرنے کے لیے رسول اکرمؐ کو بھیجا۔''

پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فضائل کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

''مَأْخُوْذًا عَلَى النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقُهُ''

''سب انبیائے کرامؑ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں عہد لیا گیا تھا کہ اُن پر ایمان لائیں۔''

اور اپنے اپنے پیروکاروں کو اُن کے ظہور کی خوش خبری سنائی:

''مَشْهُوْرَةً سِمَاتُهُ[1] كَرِيْمًا مِيْلَادُهُ''

''ان کی آمد کی علامتیں قابلِ مشاہدہ اور ان کی میلاد پسندیدہ تھی۔''

یہ تعبیر ممکن ہے آپؐ کے والدین واجداد کی عظمت کی طرف اشارہ ہو یا اُن برکتوں کی طرف، جو آپؐ کی ولادت کے وقت دنیا کو ملیں۔ تاریخی شواہد کے مطابق آپؐ کی ولادت کے وقت خانۂ کعبہ کے بت گر گئے، فارس کا آتش کدہ بجھ گیا؛ ساوہ کا وہ دریا جس کی کچھ لوگ پرستش کرتے تھے، خشک ہو گیا؛ ظالم و جابر بادشاہوں کے محلات کے کچھ حصے ٹوٹ گئے۔ یہ سب شرو بت پرستی کے مقابلے میں توحید کی راہ کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی علامات تھیں۔ پھر فرماتے ہیں:

''وَاَهْلُ الْاَرْضِ يَوْمَئِذٍ مِلَلٌ مُتَفَرِّقَةٌ وَاَهْوَاءٌ مُنْتَشِرَةٌ وَطَرَائِقُ مُتَشَتِّتَةٌ''

''اُن دنوں زمین والے مختلف مذاہب وافکار، ضد و نقیض خواہشیں اور متفرق عقائد کے حامل تھے۔''

''بَيْنَ مُشَبِّهٍ لِلّٰهِ بِخَلْقِهِ اَوْ مُلْحِدٍ فِيْ اسْمِهِ اَوْ مُشِيْرٍ اِلٰى غَيْرِهِ''

''ایک گروہ خدا کو مخلوق سے تشبیہ دیتا تھا، دوسرا اس کا نام بتوں کے لیے رکھتا تھا یا پھر کسی اور کی طرف اشارہ اور اس کی تبلیغ کرتے تھے۔''

''مُلحِد'' کا مادہ، لحد ہے، مہد کے وزن پر بمعنی گڑھا ہے، جو کسی خاص سمت کی جانب کھودا گیا ہو۔ پھر اسی مناسبت سے ہر اس کام پر اس کا اطلاق ہوا ہے جو حد وسط سے منحرف ہو کر کج روی کا شکار ہو۔ شرک و بت پرستی کو بھی اس لیے الحاد اور شرک و بت پرستوں کو ملحد کہا جاتا ہے چوں کہ وہ میانہ روی کو ترک کر کے افراط و تفریط کا شکار ہوتے ہیں۔

'' اَوْ مُلْحِدٍ فِيْ اسْمِهِ'' کے جملے سے مراد یہ ہے کہ خدا کا نام بتوں کے لیے رکھا جاتا تھا۔ مثلاً ایک بت کا نام ''لَات''، دوسرے کا ''عُزّیٰ''، تیسرے کا ''مَنَات'' رکھا جو ''اَللّٰهُ وَالْعَزِيْزُ وَالْمَنَّانُ'' سے مشتق ہیں یا مراد یہ تھی کہ خدا کے لیے ان صفات کے قائل ہوئے جو مخلوق کے لیے تھیں، اسم کو مسمیٰ کے مطابق نہیں رکھتے تھے۔ یہ دونوں تفسیریں ممکن

---

[1] ''سِمَاتُهُ''، سَمَةٌ کی جمع ہے اور علامت کے معنیٰ میں ہے۔

ہیں۔

پھر مولاؑ فرماتے ہیں:

"فَهَدَاهُمْ بِهِ مِنَ الضَّلَالَةِ وَ اَنْقَذَهُمْ بِمَكَانِهِ مِنَ الْجَهَالَةِ"

''خدا نے رسولؐ کے ذریعے گمراہی سے نجات دی، ان کے وجود کی برکت سے لوگوں کو جہالت سے نکالا۔''

ایک اور حصّے میں فرماتے ہیں:

"ثُمَّ اخْتَارَ سُبْحَانَهُ لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَ سَلَّمَ لِقَائَهُ، وَرَضِيَ لَهُ مَا عِنْدَهُ، وَ اَكْرَمَهُ عَنْ دارِ الدُّنْيَا وَرَغِبَ بِهِ عَنْ مَقَامِ الْبَلْوَى" [1]

''پھر خداوندِ عالم نے آنحضرتؐ کو اپنی ملاقات کے لیے منتخب کیا اور جو مقام اُس کے پاس ان کے لیے تھا وہ اُس نے آنحضرتؐ کے لیے پسند کیا اور اُن کو رحلت کے ذریعے اس دنیا سے آخرت کی جانب منتقل کر کے مشکلات سے نجات دی۔''

"فَقَبَضَهُ اِلَيْهِ كَرِيمًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ"

''بڑے احترام سے ان کی (خدا کا درود وسلام ہو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی پاک آلؑ پر) روح کو قبض کیا۔''

"وَ خَلَّفَ فِيكُمْ مَا خَلَّفَتِ الْاَنْبِيَاءُ فِي اُمَمِهَا"

''انھوں نے سابق انبیائے کرامؑ کی طرح اپنے بعد امّت کے لیے جانشین چھوڑا۔''

"اِذْ لَمْ يَتْرُكُوهُمْ هَمَلًا بِغَيْرِ طَرِيقٍ وَاضِحٍ وَلَا عَلَمٍ قَائِمٍ" [2]

''انھوں نے ہرگز اپنی امّتوں کو سرپرست، واضح راہ و روش اور پرچم ہدایت بلند کیے بغیر نہیں چھوڑا۔''

واضح رہے کہ امامؑ کی مندرجہ بالا تعبیر سے مراد وہی ہے، جو حدیثِ ثقلین میں بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ متواتر روایت کے مطابق رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: ''میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، کتابِ خدا اور میری عترت'' اگر ان دونوں سے متمسک رہو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہو گے، یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر میرے پاس آجائیں گے۔'' [3] کلام کو مکمل کرتے ہوئے آپؑ نے کتابِ خدا (قرآن مجید) کے بارے میں ایک

---

[1] رَغِبَ جب "فی" کے ساتھ جُڑا ہو تو کسی سے محبت کے لیے آتا ہے۔ جب ''عن'' کے ساتھ ہو تو بے توجہی کے معنی دیتا ہے۔ خدا نہیں چاہتا تھا کہ رسولؐ اس سے زیادہ مشکلات دیکھیں، اس لیے اس پست دنیا سے عالمِ بالا کی جانب بلا لیا۔

[2] هَمَلَ کا مادّہ هَمل ہے بروزنِ حمل، یعنی کسی چیز کو بے اعتنائی سے چھوڑ دینے کے معنیٰ میں ہے۔

[3] حدیثِ ثقلین کے اسناد اور شیعہ و سنی فریق کے علماء کے نزدیک اس کے تواتر سے متعلق مزید معلومات کے لیے پیامِ قرآن، ج۹ کی طرف رجوع کریں۔

جامع گفتگو کی ہے، مگر آپ نے عترت کے بارے میں یہاں گفتگو نہیں فرمائی، البتہ نہج البلاغہ کے دوسرے خطبات میں آپ نے اس بارے میں گفتگو فرمائی ہے، مولا کے اس کلام کے آخر میں ''علَمٍ قائمٍ'' کی تعبیر سے مراد ممکن ہے اوصیاءؑ ہوں۔

بہر حال انبیاء کرامؑ کا اپنی اپنی امتوں کی نسبت ہمدری صرف ان کی حیات دنیوی تک محدود نہیں ہوتی، جس طرح ایک دل سوز پدر اپنی نابالغ اولاد کے لیے موت کے لمحے تک فکر مند ہوتا ہے، بلکہ انبیاءؑ کی دلسوزی اور ہمدری دنیا و آخرت دونوں کے لیے ہوتی ہے۔ اس بنا پر آپؐ نے اپنا وصی معیّن کیا تا کہ وہ رسولؐ کی زحمتوں کو ضائع نہ ہونے دے۔

اہم نکات

پہلا نکتہ: بعثت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل ادیان و مذاہب

مندرجہ بالا عبارت میں ایک مختصر اشارہ عرب کے اُن ادیان و مذاہب کے بارے میں کیا گیا ہے، جو قبل از بعثت عصرِ جاہلیت میں عرب اور غیر عرب (عجم) کے اندر موجود تھے۔ جیسا کہ محققوں اور مورّخوں نے لکھا ہے کہ صرف دنیا میں ہی نہیں، بلکہ خود عرب میں بے شمار ایسے ادیان اور مذاہب پائے جاتے تھے، جو منحرف اور مختلف عقائد کے حامل تھے۔

معروف شارح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید عرب کے ادیان کے متعلق جو عصرِ جاہلیت میں تھے، لکھتے ہیں۔ وہ مذاہب شروع میں دو گروہوں میں تقسیم ہوئے معطّلہ اور غیر معطّلہ۔

گروہ معطّلہ: معطّلہ میں بھی پھر تقسیمات تھیں:

پہلا گروہ: خدا پر بالکل یقین نہیں رکھتا تھا۔ جیسا کہ قرآن نے کہا:

''مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيٰى وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ''

''ہماری دنیوی زندگی کے سوا (اور) کچھ نہیں ہے ہم (بس) یہیں مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں زمانے کے (حالات و واقعات کے) سوا کوئی ہلاک نہیں کرتا (گویا خدا کا مکمل انکار کرتے ہیں)۔''[1]

دوسرا گروہ: خدا پر یقین رکھتا تھا لیکن قیامت کا منکر تھا، وہ کہتے تھے:

''مَنْ يُّحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ''

---

[1] سورۂ جاثیہ: آیت ۲۴

''کون گلی ہوئی ہڈیوں کو زندہ کرے گا۔''[۱]

تیسرا گروہ: خدا اور قیامت پر یقین رکھتا تھا، لیکن بعثت انبیاؑ کا منکر تھا، بتوں کی پرستش کرتا تھا، بت پرست بھی مختلف تھے، بعض بتوں کو خدا کا شریک جانتے تھے اور اسی کلمہ شریک کا لفظ بتوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ حج کے موقع پر کہتے تھے:

"لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ"

اور ایک گروہ، بتوں کو بارگاہِ خدا میں شفیع قرار دیتا تھا، کہتے تھے:

"وَمَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى"۔[۲]

''اور ہم ان کی پرستش نہیں کرتے، مگر اس لیے کہ ہمیں خدا کے نزدیک کریں۔''

جبکہ ایک اور گروہ تشبیہ اور تجسّم کا قائل تھا۔ وہ خدا کے لیے انسان کی مانند صفات و اعضا کا قائل تھا۔ ان میں سے بعض مثلاً امیہ ابن ابی صلت کہتا تھا کہ خدا عرش پر بیٹھا ہے اور اپنے پیروں کو پھیلائے ہوئے ہے۔ (بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان افکار کے آثار بعد از بعثتِ رسول ﷺ بھی اسلام سے بے بہرہ بعض لوگوں میں پائے جاتے تھے۔[۳] ان لوگوں کا یہ گمان تھا کہ خداوند متعال ایک نوجوان کی شکل و صورت میں اپنی مخصوص سواری پر سوار آسمان سے نازل ہوتا ہے جبکہ اس کے پیروں میں سونے کے جوتے اور اس کی صورت کے گرد ایک طلائی پروانہ حرکت کر رہا ہوتا ہے یہ اور اس طرح کے کئی دیگر خرافات اور فرسودہ خیالات)

غیر معطّلہ

یہ بہت کم افراد تھے، جن کا خدا پر اعتقاد تھا اور یہ متقی و پرہیز گار لوگ تھے۔ ان میں حضرت عبدالمطلبؑ اور اُن کی اولاد حضرت عبداللہؑ و حضرت ابوطالبؑ اور قس بن ساعدہ اور اس طرح کے دوسرے افراد تھے۔[۴] نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے، عرب دانشمندوں کو مندرجہ ذیل چند گروہوں میں تقسیم کیا ہے، وہ جو صرف علمِ الانساب میں معلومات رکھتے تھے، دوسرے وہ جو خواب کی تعبیر بیان کرتے تھے اور بعض انواء کا علم رکھتے تھے، انواء یعنی (خرافات پر مشتمل ستارہ شناسی کی

---

[۱] سورۂ یٰسین: آیت ۷۸

[۲] سورۂ زمر: آیت ۳

[۳] ابن ابی الحدید نے اس مطلب کو جلد ۳، صفحہ ۲۲۷ پر لکھا ہے۔

[۴] شرح ابن ابی الحدید، ج ۱، ص ۱۱۷

ایک قسم)۔بعض کاہن تھے، جو اپنی تئیں آئندہ کے بارے میں خبر دیتے تھے۔غیر عربوں کے درمیان ایک قوم برہمن تھی، جس کے افراد ہندوستان میں زندگی بسر کر رہے تھے، وہ سوائے احکامِ عقلیہ کے کسی اور کے قائل نہیں تھے، یہ لوگ تمام ادیان کے منکر تھے جبکہ ایک دوسرا گروہ ستارہ پرست تھا، سورج پرست تھا، چاند پرست تھا یہ سب بت پرستی کی شکلیں تھیں۔[1] ان کے علاوہ یہودی، نصرانی، مجوسی تھے، جو انحرافات کا شکار تھے، مجوسی دوگانہ پرست تھے، خیر کا خدا اور شر کا خدا علیحدہ علیحدہ مانتے تھے، یہ مذہب شاید اپنے آغاز میں بعض انبیاؑ کے توسط سے وجود میں آیا تھا، جو خرافات سے بھر چکا تھا، جبکہ بعض محققین نے بیان کیا ہے کہ یہ لوگ خدائے خیر وخدائے شر پر اعتقاد رکھتے تھے، ان کے عقیدے کے مطابق جب خدائے خیر اور خدائے شر کے درمیان جنگ ہوگی اور وہ آپس میں الجھ پڑے تو فرشتوں نے ان کے درمیان بیچ بچاؤ کرایا اور ان کے درمیان یوں صلح ہوئی کہ نیچے کا عالم سات ہزار سال کے لیے خدائے شر کے اختیار میں جبکہ عالم بالا سات ہزار سال کے لیے خدائے خیر کے اختیار میں ہوگا۔[2] ادھر عیسائی تثلیث (تین خدا) کے عقیدے میں گرفتار تھے اور یہودی عجیب وغریب تحریفوں میں گرفتار ہوئے، جو انھوں نے تورات میں کیں، جن کی شرح کی یہاں گنجائش نہیں۔امامؑ نے اوپر والی عبارت میں تمام افراد کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا گروہ: یہ تشبیہ اور خدا کے لیے شریک کے قائل ہیں۔مثلاً مجوسی وعیسائی یا وہ لوگ جو خدا کے لیے انسانی صفات کے قائل تھے۔جیسے بہت سارے یہودی اس طرح کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

دوسرا گروہ: وہ جو خدا کا نام کسی اور کے لیے قرار دیتے ہیں، بہت سارے بت پرست کہ جنھوں نے خداوند متعال کے اسامی کو بتوں کے لیے انتخاب کیا ہوا ہے اور ان کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ قرار دیتے ہیں۔

تیسرا گروہ: وہ جو غیر خدا کو اشارہ کرتے ہیں، دہریہ جو فطرت کو اس جہان کا خالق مانتے ہیں، یا وہ بت پرست، چاند پرست اور ستارہ پرست جو بتوں اور ستاروں کو اصل یعنی خدا مانتے تھے۔ان حالات میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے اور آفتابِ قرآن روشن ہوا، اعلیٰ ترین مفاہیمِ توحید، دقیق ترین معارف جو خدا سے مربوط تھیں اور اُس کی صفات کے مفاہیم، نبی اکرمؐ کے ذریعے پہنچائے گئے۔تاریخ انبیاءؑ جو انتہا درجے کی خرافات سے پُر کر دی گئی تھی، اس کو پاک کر کے لوگوں کے سامنے حقائق کو بیان کیا۔وہ قوانین جو محروم اور مظلوم لوگوں کی حمایت میں تھے، ان کو اساس وبنیاد قرار دیتے ہوئے عدالت کو قائم کیا۔قرآن مجید کی عبارت کے مطابق رسول اکرمؐ نے معاشرے کو کھلی گمراہی سے نجات دی اور تہذیبِ نفس کی:

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن میثم، ج۱، ص۲۰۵

[2] شرح نہج البلاغہ ابن میثم، ج۱، ص۲۰۶

"هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیَاتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ" [1]

''وہی تو ہے جس نے مکہ والوں میں ان ہی میں کا ایک رسولؐ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور عقل کی باتیں سکھاتے ہیں اگرچہ اس کے پہلے تو یہ لوگ صریحی گمراہی میں (پڑے ہوئے) تھے۔''

ہاں، نبی مکرمؐ کی بعثت سے دین الٰہی کا چہرہ آشکار ہوا، خرافات دور ہوئے، اور تاریخِ بشریت میں ایک نیا دور رونما ہوا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے وہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں جو مرکز اسلام سے کوسوں دور ہیں۔

برناڈ شا انگریز فلسفی لکھتا ہے:

میری نظر میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین ہی وہ دین ہے، جو تاریخ بشریت کے تمام ادوار میں بنی نوع انسانیت کے تمام پہلوؤں سے سازگار اور اس کی اس طرح مکمل ہدایت و رہبری کرسکتا ہے جو تمام اقوام عالم کے لیے قابل قبول ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انسانیت کا نجات دہندہ کے نام سے یاد کیا جائے، میرا عقیدہ ہے کہ اگر آج بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے فرد کو اس دنیا کا سرپرست بنایا جائے تو تمام مشکلات باآسانی حل ہو جائیں گی، اور وہ اس جہان کو سعادت مندی اور صلح وصفائی کی طرف لے جائیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گزشتہ اور آج کے زمانے کے لیے انسانِ کامل ہیں۔ آئندہ بھی ان جیسا فرد کے آنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ [2]

دوسرا نکتہ: انبیائے کرامؑ کا آئندہ کے لیے فکرمند ہونا

امامؑ نے اس خطبے میں جو تعبیر استعمال کی، اس سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ تمام انبیا و پیغمبران الٰہی علیہم السلام صرف اپنی زندگی میں ہی نہیں بلکہ اپنے بعد کے زمانے کے لیے بھی امّت کی نسبت فکرمند رہتے تھے۔ لہٰذا آئندہ کے لیے اسبابِ ہدایت چھوڑ کر جاتے تھے، ہر وہ کام جو نبوت و رسالت کے راستے کو آگے بڑھانے کے لیے ہوتا تھا، انجام دیتے تھے۔ یقیناً پیغمبر اسلامؐ نے بھی یہی کیا، کیا یہ ممکن تھا کہ وہ اپنی اُمت کو ایسے ہی تنہا چھوڑ کر چلے جائیں؟ اور واضح راستہ اور سرپرست معیّن نہ فرمائیں، حدیثِ ثقلین جو متواتر ہے اور کتبِ شیعہ واہلِ سنت میں بیان ہوئی ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے: ''میں تمہارے

---

[1] سورۂ جمعہ: آیت ۲

[2] فی ظلال نہج البلاغہ، جلد ۱، ص ۶۳

درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، کتابِ خدا اور میری عترت۔'' کیا یہ فہمائش کہ'' میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، کتابِ خدا اور میری عترت۔'' انحرافات سے بچنے اور آئندہ کے لیے فکرمند ہونے کے لیے ایک واضح دلیل نہیں ہے؟

چودھواں حصّہ

كِتَابَ رَبِّكُمْ فِيكُمْ مُبَيِّنًا حَلَالَهُ وَ حَرَامَهُ وَ فَرَائِضَهُ وَ فَضَائِلَهُ وَ نَاسِخَهُ وَ مَنْسُوخَهُ وَ رُخَصَهُ وَ عَزَائِمَهُ وَ خَاصَّهُ وَ عَامَّهُ وَ عِبَرَهُ وَ أَمْثَالَهُ وَ مُرْسَلَهُ وَ مَحْدُودَهُ وَ مُحْكَمَهُ وَ مُتَشَابِهَهُ مُفَسِّرًا [جُمَلَهُ] مُجْمَلَهُ وَ مُبَيِّنًا غَوَامِضَهُ بَيْنَ مَأْخُوذٍ مِيثَاقُ عِلْمِهِ وَ مُوَسَّعٍ عَلَى الْعِبَادِ فِي جَهْلِهِ وَ بَيْنَ مُثْبَتٍ فِي الْكِتَابِ فَرْضُهُ وَ مَعْلُومٍ فِي السُّنَّةِ نَسْخُهُ وَ وَاجِبٍ فِي السُّنَّةِ أَخْذُهُ وَ مُرَخَّصٍ فِي الْكِتَابِ تَرْكُهُ وَ بَيْنَ وَاجِبٍ [لِوَقْتِهِ] بِوَقْتِهِ وَ زَائِلٍ فِي مُسْتَقْبَلِهِ وَ مُبَايَنٌ بَيْنَ مَحَارِمِهِ مِنْ كَبِيرٍ أَوْعَدَ عَلَيْهِ نِيرَانَهُ أَوْ صَغِيرٍ أَرْصَدَ لَهُ غُفْرَانَهُ وَ بَيْنَ مَقْبُولٍ فِي أَدْنَاهُ [وَ] مُوَسَّعٍ فِي أَقْصَاهُ.

''انہوں نے تمہارے درمیان تمہارے پروردگار کی کتاب کو چھوڑا ہے، جس میں حلال وحرام، فرائض وفضائل، ناسخ ومنسوخ، رخصت وعزیمت، خاص و عام، عبرت و امثال، مطلق ومقید، محکم و متشابہ سب کو واضح کر دیا تھا۔ مجمل کی تفسیر کر دی تھی گتھیوں کو سلجھا دیا تھا۔ اس میں بعض آیات ہیں، جن کے علم کا عہد لیا گیا ہے اور بعض سے ناواقفیت کو معاف کر دیا گیا ہے۔ بعض احکام کے فرض کا کتاب میں ذکر کیا گیا ہے اور سنّت سے ان کے منسوخ ہونے کا علم حاصل ہوا ہے یا سنّت میں ان کے وجوب کا ذکر ہوا ہے، جب کہ کتاب میں ترک کرنے کی آزادی کا ذکر تھا۔ بعض احکام ایک وقت میں واجب ہوئے ہیں اور مستقبل میں ختم کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے محرمات میں بعض پر جہنم کی سزا سنائی گئی ہے اور بعض گناہِ صغیرہ ہیں جن کی بخشش کی امید دلائی گئی ہے۔ بعض احکام ہیں جن کا مختصر بھی قابلِ قبول ہے اور زیادہ کی بھی گنجائش پائی جاتی ہے۔''

شرح وتفسیر

قرآن کی خصوصیات

نہج البلاغہ کے خطبوں میں قرآن مجید کی اہمیت اور عظمت کا بارہا ذکر کیا گیا ہے، اوران میں سے ہر بات، کچھ دیگر مطالب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہاں پر امیر المومنین علیہ السلام نے قرآن مجید کی جامعیت کے بارے میں ایک مفصّل بحث فرمائی ہے، کیوں کہ حضرت امام علی علیہ السلام کا اصل ہدف یہ تھا کہ لوگوں کو اس نکتے کی طرف توجہ دلائیں کہ اگر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کے درمیان سے چلے بھی گئے ہیں، تو ایک جامع ومفصّل کتاب کو ان کے درمیان یادگار کے طور پر چھوڑ کر گئے ہیں کہ جس میں لوگوں کی زندگی کی مادّی اور معنوی، انفرادی اور اجتماعی نیز تمام ذمّے داریوں کو ہر طرح سے روشن کر دیا گیا ہے، مولاؑ نے خطبے کے آغاز میں فرمایا: "کِتَابَ رَبِّکُمْ فِیْکُمْ" [1]

''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے پروردگار کی کتاب قرآن مجید کو تمہارے درمیان یادگار کے طور پر چھوڑ گئے ہیں۔'' اور پھر آگے چل کر قرآن مجید کی جامعیت اور خصوصیات پر چودہ نکات کی طرف اشارہ کیا ہے:

چودہ نکات

۱۔حلال اور حرامِ الٰہی

"مُبَیِّناً حَلَالَهُ وَحَرَامَهُ وَفَرَائِضَهُ وَفَضَائِلَهُ" [2]

''حلال، حرام فرائض، فضائل، اور مستحباتِ الٰہی کو روشن اور واضح کیا۔'' اس جملے میں احکامِ پنجگانہ کی طرف واضح اشارہ ہے، فرائض سے مراد واجبات کی طرف اشارہ ہے اور فضائل سے مراد مستحبات ہیں۔ حرام سے مراد محرمات اور حلال کی

---

[1] کتاب، منصوب ''کتاباً'' ہے اور یہ 'ما' کے لیے عطفِ بیان کے طور پر آیا ہے، جو "خَلَفَ فِیْکُمْ مَا خَلَّفَتِ الْاَنْبِیَاءُ" میں ہے یا پھر کتاب مفعول ہے ''خَلَّفَ'' یا ''اَعْنِیْ'' کے لیے جو تقدیر میں ہے۔

[2] "مبیّنا" اسمِ فاعل کی صورت میں ہے اور خلف کے فاعل کے لیے حال ہے، یعنی پیغمبر اکرمؐ اور "حلاله وحرامه" کی ضمیریں قرآن مجید کی طرف پلٹتی ہیں۔ نہج البلاغہ کے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مُبَیِّنا اور بعد میں آنے والے دیگر اوصاف جیسے مُفَسِّراً کِتَابَ اللہ کے لیے حال ہے اور حلالہ کی ضمیر بھی کتابُ اللہ کی طرف یا "رَبِّکُمْ" کی طرف پلٹتی ہے لیکن جو تفسیر کتاب کے متن میں آئی ہے، وہ سب سے مناسب ہے۔

میں مباحات اور مکروہات شامل ہیں۔

۲۔ناسخ ومنسوخ

آیات کے ناسخ ومنسوخ ہونے کو بیان کیا: "وَنَاسِخُهُ وَمَنْسُوخُهُ" ناسخ ومنسوخ سے مراد ہر وہ نیا حکم ہے، جس کے نازل ہونے پر پہلے والا حکم ختم ہوجاتا ہے۔ یہ صرف پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں واقع ہوا، کیوں کہ وحی کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور آپؐ کے زمانے میں احکام میں تبدیلی کا امکان تھا۔ اگر چہ کچھ احکام ظاہری طور پر مطلق حکم کی صورت میں تھے، لیکن باطن میں مقید یعنی معیّن وقت کے لیے تھے، جب وقت ختم ہوگیا تو حکم بھی ختم ہوگیا اور اس کی جگہ نیا حکم آیا، جسے ناسخ کہتے ہیں۔ اس کی مثال وہ آیت ہے، جس میں پیغمبر اکرمؐ سے سرگوشی کرنے سے پہلے مسلمانوں کو صدقہ وخیرات دینے کا حکم دیا گیا ہے:

"يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً"[1]

''اے ایمان والو! پیغمبر اکرمؐ سے جب تم سرگوشی کرنا چاہو تو گفتگو کرنے سے پہلے خدا کی راہ میں صدقہ دیا کرو۔''

یہ مسلمانوں کے لیے ایک امتحان تھا کہ جس پر صرف ایک فرد یعنی ''امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام'' نے عمل کیا۔ اور جلد ہی ناسخ آیت نازل ہوئی اور ارشاد ہوا:

"أَأَشْفَقْتُمْ أَنْ تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَاتٍ فَإِذْ لَمْ تَفْعَلُوا وَتَابَ اللهُ عَلَيْكُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا اللهَ وَرَسُولَهُ وَاللهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ"[2]

''کیا تم صدقات دینے کی وجہ سے تنگدستی اور فقیر ہونے سے ڈر گئے، سرگوشی اور راز کی بات کرنے سے پہلے ہی رک کیوں گئے؟ اب جبکہ اس کام کو انجام نہیں دے سکے ہو تو خداوند عالم نے تمہاری توبہ قبول کیا پس تم نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرو اور جان لو! خداوند عالم جو کچھ تم انجام دیتا ہے اُس سے باخبر ہے۔''

۳۔مباح اور ممنوع

ہم نے مباح اور ممنوع احکام کی بھی وضاحت کردی "وَرُخَصُهُ وَعَزَائِمُهُ" اس سے مراد ممکن ہے کہ وہ اصل ہو، جو آج کے علمِ اصول اور علمِ فقہ میں معروف ہے کہ ''جب کبھی کوئی واجب یا حرام کا حکم اٹھ جائے تو مباح میں تبدیل ہوجاتا

---

[1] سورۂ مجادلہ: آیت ۱۲

[2] سورۂ مجادلہ: آیت ۱۳

ہے۔'' جیسے ارشاد ہوا: ''وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا''[۱] جب احرام سے باہر آجاؤ تو شکار کر سکتے ہو۔ یہ بات بھی مسلّم ہے کہ احرام سے نکلنے کے بعد شکار کرنا کوئی واجب نہیں ہے، بلکہ مباح ہے۔ اور کبھی یہ حکم ضد میں تبدیل ہوجاتا ہے، یعنی مباح کے خلاف حکم آجاتا ہے۔

''وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ''[۲]

''جب تم رُوئے زمین پر سفر کرو تو اس صورت میں اگر نماز میں کمی کردو تو تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ یہ''

بات بھی سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ سفر میں نماز قصر پڑھنا واجب ہے، نہ کہ مباح۔ واجب و حرام کے مباح کے حکم میں تبدیل ہونے کو ''رخصت'' کہتے ہیں وہ اس لیے کہ ہر دو طرف عمل کرنا جائز ہے۔ کسی کام کے کرنے کا عزم کر لینے کو ''عزیمت'' کہتے ہیں۔ ان دو اہم اصطلاحات کی تفسیر کے بارے میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ رخصت سے مراد احکامِ واجب یا حرام ہیں، جن میں سے کچھ موارد مستثنیٰ ہوگئے ہیں۔ جیسے

''فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ''[۳]

''اگر کوئی شخص مجبور ہو اور سرکشی اور زیادتی کرنے والا نہ ہو اور اس (حرام) میں سے کچھ کھالے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔'' جیسے جان بچانے کے لیے مردار کے گوشت سے صرف اسی مقدار کو کھا سکتے ہیں جتنی مقدار میں اس کی جان بچ جائے۔

عزائم ایسے احکام ہیں کہ جن میں کسی قسم کا کوئی استثنا موجود نہیں ہے، جیسے:

''وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا''[۴]

''اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اُس کا شریک قرار نہ دو۔''

۴۔ خاص و عام

خاص و عام احکام کے بارے میں جو آیات ہیں، ان کی بھی وضاحت کردی ہے: ''وَخَاصَّهُ وَعَامَّهُ''

خاص: وہ احکام ہیں، جن میں ہر مسلمان شامل نہیں ہوتا بلکہ مخصوص افراد شامل ہوتے ہیں، جیسے حجِ بیت اللہ کا حکم، جو صرف مستطیع افراد سے مخصوص ہے:

---

[۱] سورۂ مائدہ: آیت ۲

[۲] سورۂ نساء: آیت ۱۰۱

[۳] سورۂ بقرہ، آیت ۱۷۳

[۴] سورۂ نساء، آیت ۳۶

"وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا"۔[۱]

''اور لوگوں پر واجب ہے کہ محض خدا کے لیے خانہ کعبہ کا حج کریں جنہیں وہاں تک پہنچنے کی استطاعت (قدرت) ہو۔''

عام: وہ احکام ہیں جو ہر مسلمان کے لیے ہیں۔ جیسے نماز کا حکم جو سب کے لیے ہے، جیسے:

"وَاَقِيمُوا الصَّلَاةَ"

''نماز قائم کرو۔''

یہاں پر یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ خاص سے مراد ایسی آیات ہیں، جو ظاہراً عمومیت پر دلالت کرتی ہیں، لیکن درحقیقت وہ کسی مخصوص مورد کے لیے ہیں، جیسے آیۂ ولایت:

"إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ"۔[۲]

تمہارے مالک اور سرپرست صرف خدا اور اُس کا رسولؐ اور وہ مومنین ہیں، جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔''

یہاں پر اس آیت کا مصداق صرف ایک ہے، اس سے زیادہ نہیں ہے اور وہ امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہما السلام کی ذاتِ گرامی ہے۔ لیکن عام سے مراد وہ آیات ہیں، جو عمومیت پر دلالت کرتی اور سب کو شامل کرتی ہیں، جیسے:

"وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا"۔[۳]

''چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھوں کو کاٹ دو۔''

۵۔ وعظ و نصیحت

''اُس میں نصیحتیں بھی ہیں اور مثالیں بھی ہیں "وَعِبَرَهُ وَاَمْثَالَهُ"۔ "عبر" عبرت کے مادّے سے ہے اور اس کو عبور سے لیا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب کبھی انسان کسی حادثے کو دیکھتا ہے اور وہاں سے گزرتا ہے، تو وہاں سے اُسے مختلف مصادیق ملتے اور سمجھ میں آتے ہیں، جن سے انسان عبرت حاصل کرسکتا ہے۔ قرآن مجید تاریخ انبیاءؑ اور سابقہ قوموں کی

---

[۱] سورۂ آل عمران، آیت ۹۷

[۲] سورۂ مائدہ، آیت ۵۵

[۳] سورۂ مائدہ: آیت ۳۸

عبرتناک داستانوں سے مالا مال ہے، جو تہذیب نفس اور تربیت حاصل کرنے میں مفید ہیں۔

"امثال" قرآن مجید میں آنے والی مثالوں کی طرف اشارہ ہے، جن کی تعداد فراواں ہے، جیسے:

"أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ"[۱]

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے اچھی بات (مثلاً کلمہ توحید) کی کیسی (اچھی) مثال بیان کی ہے کہ (اچھی بات) گویا ایک پاکیزہ درخت ہے۔''

اچھی بات گویا ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے، جو پھلوں سے لدا ہوا ہے اور اس سے خاص افراد کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے، جن کی زندگی قرآن مجید میں ایک مثال اور آئیڈیل کے طور پر بیان ہوئی ہے، جیسے، خداوند عالم نے مومنین کے لیے فرعون کی بیوی کی مثال بیان فرمائی:

"وَضَرَبَ اللهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَةَ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِندَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِن فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ"[۲]

''اور خدا نے مومنین (کی تسلی) کے لیے فرعون کی بیوی (آسیہ) کی مثال بیان فرمائی ہے کہ جب اس نے دعا کی پروردگارا میرے لیے اپنے یہاں بہشت میں ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کی کارستانی سے نجات دے اور مجھے ظالم لوگوں (کے ہاتھ) سے چھٹکارا عطا فرما۔''

۶۔ مطلق ومقید

ایسی آیات کو بھی روشن تر انداز میں بیان کیا گیا ہے اور اُن کی وضاحت فرمائی ہے: "وَمُرْسَلَهُ وَمَحْدُودَهُ"

مطلق: وہ احکام ہیں جو کسی قید وشرط کے بغیر بیان ہوئے ہیں، جیسے:

"أَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ"[۳]

''خداوند عالم نے خرید وفروخت کو حلال کر دیا ہے۔''

مقید: ایسا حکم ہے جو کسی شرط اور قید کے ساتھ بیان ہوا ہو، جیسے، وہ کاروبار جو آپ کی رضامندی سے انجام پایا ہو:

---

[۱] سورۂ ابراہیمؑ: آیت ۲۴

[۲] سورۂ تحریم، آیت ۱۱

[۳] سورۂ بقرہ: آیت ۲۷۵

"تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ" [۱]

واضح ہے کہ مطلق ومقید کے درمیان مطلق کو مقید کے ذریعے پابند کرتے ہیں اور مذکورہ بالا مثال میں صرف اس معاملے اور کام کو صحیح جانتے ہیں کہ جس میں طرفین راضی ہوں۔

نیز مطلق سے مراد ایسے احکام کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے، جو قید وشرط کے بغیر بیان ہوئے ہیں اور مقید سے مراد وہ احکام ہوں جو قید وشرط کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، جیسے بے جا قسم کھانے پر اُس کے کفارے میں ایک غلام آزاد کرنا ہے:

"اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ" [۲]

''یا ایک غلام آزاد کرانا۔''

جب کہ قتلِ خطا کے کفارے کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں:

"فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ" [۳]

''ایک بندۂ مومن کو آزاد کرو۔''

۷۔ محکم اور متشابہ آیات

محکم اور متشابہ آیات کو بھی واضح فرمایا ہے، جیسے:

"وَمُحْكَمَهُ وَمُتَشَابِهَهُ"

محکم: ایسی آیات کی طرف اشارہ ہے، جو مکمل روشن اور واضح ہیں، جیسے:

"قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ"

''کہو اللہ یگانہ ہے۔''

متشابہ: اس سے مراد ایسی آیات کی طرف اشارہ ہے، جو پہلی نظر میں غیر واضح محسوس ہوتی ہیں، اگرچہ دوسری آیات کی مدد سے ان کا ابہام اور پیچیدگی دور ہوجاتی ہے، جیسے:

"اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" [۴]

---

[۱] سورۂ نساء: آیت ۲۹

[۲] سورۂ مائدہ: آیت ۸۹

[۳] سورۂ نساء: آیت ۹۲

[۴] سورۂ قیامت، آیت ۲۳

''(اُس دن) آنکھیں اپنے پروردگار کو دیکھ رہی ہوں گی۔''

دیگر آیات کی روشنی میں کہا جاتا ہے کہ خداوند متعال کے لیے نہ کوئی مکان ہے، نہ زمان اور نہ وہ جسم رکھتا ہے اور نہ اُسے دیکھا جاسکتا ہے اس سے ظاہری ابہام برطرف ہوجاتا ہے، جیسے:

''لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ''

''اسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے۔''[1]

۸۔ایک اور خاصیت

قرآن مجید کی کچھ مخصوص آیات جو تشریح طلب تھیں: ''مُفَسِّرًا مُجْمَلَهُ وَمُبَيِّنًا غَوَامِضَهُ''، ان کی تفصیلات اور تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیانِ مبارک سے ہوئی ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتیں کہ جن میں باریکیاں تھیں، وہ آپؐ کی تقریروں سے روشن اور واضح ہوجاتی ہیں۔

مجمل: ایسی آیات کی طرح ہیں کہ جن میں نماز کا حکم تو موجود ہے، لیکن رکعات اور ارکانِ نماز کی تفسیر موجود نہیں ہے، مگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی تفصیل وتشریح فرماتے ہیں۔

غوامض: اس کی مثال قرآن مجید میں ''حروفِ مقطّعات'' کی ہے کہ جن کی تفصیل احادیث اسلامی میں واضح طور پر بیان ہوئی ہے۔غوامض میں اور متشابہات میں جو فرق ہے وہ شاید یہ ہو کہ متشابہات کا تعلق ''معنی اور مفاہیم میں ابتدائی نظر کے ابہام'' سے ہے جبکہ غوامض کا تعلق ابتدائی نظر میں ہی کاملاً ابہام سے ہے، یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے تفسیر کی ضرورت ہے، جس کی مثال اوپر بیان ہوچکی۔

۹۔ جہالت کا سہارا

''بَيْنَ مَأْخُوْذٍ مِيْثَاقُ عِلْمِهِ وَمُوَسَّعٍ عَلَى الْعِبَادِ فِيْ جَهْلِهِ''

قرآن مجید میں چند حقائق ایسے ہیں، جن کی معرفت حاصل کرنے کے بارے میں سب سے عہد و پیمان لیا گیا ہے، ان کی نسبت کوئی بھی نادانی اور جہل کا سہارا لے کر عذر پیش نہیں کرسکتا؛ اور بعض موضوعاتِ قرآن ایسے ہیں، جن کے بارے میں معرفت رکھنا، ہر خاص وعام کا وظیفہ نہیں۔

---

[1] سورۂ انعام، آیت ۱۰۳

پہلی قسم کے حقائق: جیسے وہ آیات جو خدا کی وحدانیت اور صفات کو بیان کر رہی ہیں، اُن سے تمام مؤمنین کو آگاہ اور باخبر ہونا چاہیے۔

دوسری قسم کے حقائق: جیسے وہ آیات جو ذاتِ پروردگار عالم کی حقیقت بیان کرنے کے لیے ہیں، اُس کی ذات کی حقیقت اور تہہ تک پہنچنا کسی کے بس کی بات نہیں اور اُس تک رسائی ممکن نہیں۔ یہ دراصل معاد اور قیامت کی اصل حقیقت کی طرح ہے کہ کوئی اس کے عمق تک نہیں پہنچ سکتا۔ پس جب انسان کی حقیقتِ الٰہی اور قیامت کی اصلیت تک رسائی ممکن نہیں ہے تو اُس کے لیے ان چیزوں پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے اور وہ ان کے اعتقادی پہلو سے باخبر رہے، جبکہ جنت اور جہنم کی تفصیلات سے آگاہی ضروری قرار نہیں دی گئی ہے۔

۱۰۔ جزوقتی احکام

"وَبَيْنَ مُثْبَتٍ فِي الْكِتَابِ فَرْضُهُ وَمَعْلُومٍ فِي السَّنَةِ نَسْخُهُ"

احکام میں سے کچھ محدود زمانے کے لیے ہیں اور ان احکام کے لیے سنّت کا نسخ ہونا پیغمبر اکرمؐ کے ذریعے معلوم اور روشن ہو گیا ہے۔ جیسے (زنائے محصنہ) شادی شدہ مرد یا عورت کے زنا کرنے کی حد جنہیں قرآن مجید میں حبسِ ابد کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔[1] اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کے بعد کچھ احادیث رجم کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، یہ نسخ کے حکم میں آتی ہیں۔

۱۱۔ ایک عمل سنّت میں واجب، لیکن آیات میں متروک

"وَوَاجِبٍ فِي السُّنَّةِ أَخْذُهُ وَمُرَخَّصٍ فِي الْكِتَابِ تَرْكُهُ"

سنّت میں وہ احکام جن پر عمل کرنا واجب ہے، لیکن قرآن مجید میں ان کے ترک کرنے کی اجازت موجود ہے، اس بنیاد پر کہ سنّت آیات کے ذریعے نسخ ہوئی ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت جیسے روزے کا حکم تھا کہ اُس وقت مسلمان صرف رات کے شروع ہونے کے ساتھ ہی افطار کر سکتے تھے۔ اگر اس موقع پر سو گئے یا کسی اور کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے روزہ افطار نہ کر سکے تو بیدار ہونے، یا کام سے فارغ ہونے کے بعد روزہ کھولنا یا افطار کرنا ان کے لیے جائز نہیں تھا، لیکن یہ سنّت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعد میں اس آیۂ مجیدہ کے ذریعے منسوخ ہو گئی۔

---

[1] سورۂ نساء: آیت ۱۵

ارشاد ہوا:

"وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ" [۱]

''کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی کالی دھاری سے (آسمان پر مشرق کی طرف) تمہیں صاف نظر آنے لگے۔''

۱۲۔ واجبِ موقّت

"وَبَيْنَ وَاجِبٍ بِوَقْتِهِ وَزَائِلٍ فِيْ مُسْتَقْبَلِهِ"

بعض احکام شروع میں واجب ہوئے، لیکن بعد میں ان احکام کی وجوبیت ختم ہو گئی۔ اس عبارت میں حقیقت میں ''واجباتِ موقّت اور واجباتِ غیر موقّت'' کی طرف اشارہ ہے۔

جیسے ماہِ مبارک رمضان کے روزے جو اسی مہینے میں پورے رکھنا واجب ہیں۔ اگر پورے ہوئے تو دوسرے مہینوں میں واجب نہیں، لیکن جو واجبات دائمی ہیں، وہ گردن سے ساقط نہیں، جیسے امر بالمعروف و نہی عن المنکر، حق اور عدل وانصاف کے لیے قیام کرنا ہر مسلمان پر ہمیشہ واجب ہے۔ [۲] بعض نے واجباتِ موقّت سے مراد حج کے فرائض کو لیا ہے، جو کہ پوری زندگی میں ایک بار واجب ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس عمل کی وجوبیت ختم ہو جاتی ہے۔ بعض نے اس سے مراد ہجرت کو لیا ہے کہ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کی بہت کم تعداد تھی، اس وجہ سے ان پر ہجرت کرنا واجب ہو گئی۔ لیکن فتح مکہ کے بعد پھر ہجرت کا وجوب ساقط ہو گیا، مگر مکہ کی طرح دوسرے علاقوں میں فتح مکہ سے پہلے والے حالات موجود ہیں اور ہجرت کا مسئلہ بھی اپنی جگہ پر باقی ہے۔

۱۳۔ گناہان

"وَمُبَايِنٌ [۳] بَيْنَ مَحَارِمِهِ مِنْ كَبِيْرٍ اَوْعَدَ عَلَيْهِ نِيْرَانَهُ، اَوْ صَغِيْرٍ اَرْصَدَ لَهُ غُفْرَانَهُ"

تمام محرمات کی اقسام میں سے ہر ایک کو جداگانہ، روشن و واضح کر دیا گیا ہے، جن میں گناہانِ کبیرہ بھی ہیں، جن کے

[۱] سورۂ بقرہ: آیت ۱۸۷

[۲] اس جملے میں کچھ کلمات محذوف ہیں، تقدیر میں اس طرح ہیں "وَبَيْنَ مَا يَكُوْنُ وَاجِباً دَائِماً أَبَداً"

[۳] مبائن ''مبتدا'' محذوف کے لیے خبر ہے، تقدیر میں ''هو مبائن'' ہے اور ضمیر ''هو'' پوشیدہ ہے جو کتاب کی طرف پلٹتی ہے۔ ایک اور احتمال بھی یہاں موجود ہے مگر مناسب وہی ہے جسے ہم نے بیان کیا۔

بارے میں عذاب سے ڈرایا گیا ہے اور گناہانِ صغیرہ بھی ہیں، جن کے بارے میں توبہ اور معافی کا راستہ کھلا رکھا گیا ہے۔

گناہانِ کبیرہ: جیسے شرک [۱] اور قتل نفس [۲] ہے۔ قرآن مجید میں ان گناہوں کی نسبت صریحاً عذاب کا وعدہ دیا گیا ہے۔

گناہانِ صغیرہ: وہی ہیں، جن کا سورۂ نجم آیت ۳۲ میں تذکرہ ہوا ہے جو ''اللَّمَم'' کے عنوان سے آیا ہے:

''اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ'' [۳]

''جو صغیرہ گناہوں کے سوا کبیرہ گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے رہتے ہیں۔''

بعض مفسرین نے ''لَمَم'' کی، گناہ کیے بغیر صرف گناہ کی نیت کرنے یا معمولی گناہ کے طور پر تفسیر کی ہے۔

۱۴۔ قلیل اعمال مقبول اور زیادہ کی اجازت

''وَبَيْنَ مَقْبُوْلٍ فِيْ اَدْنَاهُ، مُوَسَّعٍ فِيْ اَقْصَاهُ''

بعض احکام کی تھوڑی سی مقدار پر عمل قابلِ قبول ہے اور اس عمل کو کثرت سے انجام دینا جائز اور اچھا عمل کہلائے گا۔ یہ مثالیں ان اعمال اور پروگراموں کے بارے میں ہیں کہ جن کو کم مقدار میں انجام دینے کی تاکید ہوئی ہے، مگر لوگ یہ عمل زیادہ سے زیادہ بھی انجام دے سکتے ہیں، اس میں وہ آزاد ہیں۔ نہج البلاغہ کے بعض مفسرین نے یہ مثال تلاوتِ قرآن مجید سے تعبیر کی ہے کہ جس میں تلاوت کا حکم ہوا ہے۔

''فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ'' [۴]

جتنی آسانی کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کر سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔ یہاں قرآن مجید میں سے کچھ مقدار کی تلاوت کرنے کی تاکید ہوئی ہے، لیکن کوئی زیادہ پڑھنا چاہے تو اسے اختیار دیا ہے۔ (سورۂ مزمّل کی آخری آیتیں تلاوت کی اجازت کی طرف بخوبی اشارہ کرتی ہیں)

اس قسم کے احکام کے برعکس ایسے احکام بھی ہیں جن پر عمل کرنا لازمی اور واجب معیّن ہے جیسے:

''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

---

[۱] شرک کے بارے میں ارشاد ہوا، سورۂ مائدہ، آیت ۷۲: ''مَن يُشْرِكْ بِاللهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ''

[۲] قتلِ نفس کے بارے میں ارشاد ہوا، سورۂ نساء: آیت ۹۳: ''وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِناً مُّتَعَمِّداً فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيهَا''

[۳] سورۂ نجم: آیت ۳۲

[۴] سورۂ مزمّل: آیت ۲۰

تَتَّقُونَ ○أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ○ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ○"[1]

ماہِ مبارک رمضان کا روزہ تمام مکلّفین پر (جن پر روزہ واجب ہے، ان سب پر پورا ایک مہینہ بغیر کسی کمی وبیشی کے) واجب ہے۔ (اگر کوئی عذرِ شرعی رکھتا ہو تو اس کا مسئلہ جداگانہ ہے۔ مترجم)

نکات

۱۔ قرآن مجید کی جامعیت

امیر المومنین علیہ السلام کے کلام کے اس حصے میں جو چیز بادی النظر میں دکھائی دیتی ہے وہ مسئلہ جامعیت قرآن اور اعجازِ قرآنِ کریم ہے۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے چودہ نکات کے ذریعے قرآن مجید کی عظمت کو بیان فرمایا ہے۔ آپؑ نے قرآن مجید کی باریکیوں اور مختلف چھوٹے چھوٹے نکات کو نہایت عمدہ طریقے سے تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور مسائل اعتقادی، عملی مسائل، اَخلاقی مسائل کو واجبات اور محرمات کی رُو سے اور قرآن وسنّت کے درمیان روابط، احکامِ ثابت وموقّت، عام و خاص، مطلق ومقید اور ناسخ ومنسوخ سے متعلق اور ان کے درمیان رابطے کے بارے میں لوگوں کے حالات اور ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے بہترین انداز میں سمجھایا ہے۔ ان احکام میں غور وفکر سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے معانی ومفاہیم اور نکات پر کس قدر باریک بینی سے کام ہوا ہے اور جنہیں انسان کی ضرورتوں کے عین مطابق بیان کیا گیا ہے۔

چنانچہ اعجازِ قرآن کریم کی بحث میں ہم نے کہا ہے کہ جامعیّتِ قرآن کا دقیق، متنوع اور جامع ہونا قرآن مجید کے معجزات میں شامل ہے۔ انسان یہ کیسے یقین کر لیتا ہے کہ ایک بغیر پڑھا لکھا انسان جہالت کے تاریک ماحول سے اٹھ کر آئے، اور فیوضاتِ وحی سے مدد لیے بغیر، صرف اپنی سوچ وفکر پر بھروسا کرتے ہوئے ایسی کتاب ان کے ہاتھ میں دیدے، جو عبرتوں کے واقعات سے بھری ہوئی ہو اور خوبصورت مثالوں سے مزین ہو، گویا جامع احکام اور معارفِ الٰہی سے پُر ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ: آیات ۱۸۳ تا ۱۸۵

عمدہ بات یہ ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے اپنی اس مختصر گفتگو میں اصولِ فقہ کے مکمل ایک دورے کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور ایسے مطالب کو نہایت آسان اور تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے جو آج کے علمِ اصول میں، جو صدیوں میں تکمیل تک پہنچا ہے، بیان ہوئے ہیں مثلاً حرام وحلال کے مسائل، ناسخ ومنسوخ، رخصت وعزیمت، خاص وعام، مطلق ومقید، محکم ومتشابہ، مجمل ومبین، موقّت وغیر موقّت، واجب ومستحب، مستحب موکد، وغیر موکد سب کو ایک دوسرے سے الگ کر کے اجمالی طور پر ان مسائل کی طرف سب کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

۲۔ قرآنِ کریم کا علم کس کے پاس ہے؟

دی گئی مثالوں سے استفادہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے فرائض میں سے ہے کہ کتاب اللہ میں سے کچھ مجمل آیات یا اس کے غوامض (وہ کلمات جو حروفِ مقطّعات کی طرح غیر واضح ہیں) کو واضح طور پر بیان کریں، تاکہ کسی کے لیے کوئی ابہام باقی نہ رہے۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

"مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ"[1]

''رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو تمہیں دیں اُسے لے لو۔''

ممکن ہے یہاں پر بعض کے لیے یہ سوال پیش آئے کہ قرآن مجید کیوں مجمل اور پیچیدگیوں کی تشریح کا محتاج ہے؟ جب کہ یہ کتاب سب کی ہدایت اور آسانی سے سمجھنے کے لیے نازل ہوئی ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے دو نکات کی طرف توجہ دینا ضروری ہے:

نکتۂ اوّل: قرآن مجید اسلام کے بنیادی قوانین بیان کرنے والا ہے، وہ مسائل کے اصول بیان کرتا ہے، تمام جزئیات کو ان کی ظاہری تعبیرات اور مثالوں کے ساتھ بیان نہیں کرتا، ان کی تشریح وتفسیر اور وضاحت کرنا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمے داری ہے۔ مثلاً نماز وحج وروزے کے وجوب اور کسی قدر کلّی احکام کے بارے میں قرآن مجید میں آیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ان عبادات کی شرائط، اجزا، موانع وفروع بہت زیادہ ہیں، ان سب کی الگ الگ شرح سے ایک مناسب اور ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ اور اسی طرح معاملات، قضاوت، شہادت، حدود، کلّی طور پر اسلامی سیاسیات سے مربوط مسائل، ان میں سے ہر ایک کی جداگانہ شرح اور وضاحت کی ضرورت ہے۔ یہ کام کثیر تعداد میں لکھی گئی کتابیں بھی انجام نہیں دے سکتیں، بلکہ خدا کے رسولؐ کی ضرورت ہے کہ وہ مقصدِ الٰہی کو بیان کریں۔

---

[1] سورۂ حشر: آیت ۷

نکتۂ دوّم:

مجملات و مہمّات کی تفسیر اور پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے لوگوں کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت کی وجہ سے ان کا رابطہ سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قائم رہتا ہے، یہی وہ ارتباط ہے، جو لوگوں کو ہر دور میں اپنے ہادیوں ،اماموں اور رہبروں کی طرف راہ دکھاتا ہے اور جوڑے رکھتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن کریم وہ کتاب ہے، جس کے پڑھنے والے یہ احساس کرتے ہیں کہ اس میں سے کچھ مقدار سمجھنے کے لیے بھی اُستاد کی ضرورت ہے، جب اُستاد کے ساتھ ان کا رابطہ جڑا رہے گا تو اور بھی بہت سے حقائق ان پر واضح ہوسکیں گے۔

اب یہاں پر سوال یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد یہ معلمِ الٰہی مسلمانوں کے درمیان موجود ہے یا نہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایسی ہستی کا مسلمانوں میں موجود ہونا ضروری ہے ورنہ مشکلات جوں کی توں باقی رہیں گی ۔یہی وہ مقام ہے جہاں ہم معتقد ہیں کہ ہر دور میں ایک ایسے امامِ معصوم کا موجود ہونا ضروری ہے، جن کے پاس تمام قرآن مجید کا علم موجود ہو اور وہ وہی ہستیاں ہیں، جنھیں پیغمبر اکرمؐ نے ثقلین جیسی متواتر روایت میں ''عترت'' کے نام سے یاد فرمایا ہے اور ان ہستیوں اور قرآنِ کریم کے اٹوٹ انگ کو قیامت تک کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے:

"اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ كِتَابَ اللهِ وَ عِتْرَتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا اَبَداً، وَاِنَّهُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ"۔[1]

۳۔ کبیرہ وصغیرہ گناہوں کے پہچاننے کا معیار

اس مسئلے میں کہ گناہوں میں سے کون سا بڑا اور کون سا چھوٹا گناہ ہے؟ دانشوروں کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض دانشوروں نے ان دونوں کا آپس میں موازنہ کرتے ہوئے نسبتی امور قرار دیا ہے یعنی ان میں سے جس گناہ کی سزا کی اہمیت بیشتر ہو وہ کبیرہ گناہ ہے اور جس کی اہمیت کم ہو وہ صغیرہ گناہ ہے۔ مرحوم طبرسی نے ''مجمع البیان'' میں اس عقیدے کو شیعہ دانشوروں کی طرف نسبت دی ہے، ظاہراً ان کے کہنے کا مقصد بعض شیعہ دانشور ہیں، کیوں کہ بہت سے شیعہ دانشوروں کا عقیدہ یہ نہیں ہے، بلکہ وہ اس بارے میں دوسرا عقیدہ رکھتے ہیں، جس سے متعلق گفتگو آگے آئے گی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ

---

[1] بیان شدہ تمام تعبیرات وہ ہیں جو شیعہ وسنّی منابع سے لی گئی ہیں۔ احقاق: جلد ۹، ص ۳۰۹ تا ۳۷۵، بحار الانوار، جلد ۲۳، ص ۱۱۸، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۵۵۔ پیامِ قرآن، جلد ۹۔

گناہانِ کبیرہ ان الفاظ سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعاً بڑے گناہ ہیں اور عقل وشرع کے لحاظ سے بھی یہ امور اہمیت کے حامل ہیں۔ جیسے قتلِ نفس، لوگوں کے حقوق غصب کرنا، سودخوری، اور زنا کرنا وغیرہ۔ شاید یہی وجہ ہو کہ روایاتِ اہلِ بیتؑ میں اس گناہ کی شدت اور اہمیت کی وجہ سے انجام دینے والے کو عذابِ الٰہی کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام، امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام علی الرضا علیہ السلام سے ایک مشہور معروف حدیث نقل ہوئی ہے:

"اَلْکَبَائِرُ الَّتِیْ اَوْجَبَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ عَلَیْهَا النَّارَ"۔[۱]

کبیرہ گناہ وہ ہے، جس کے لیے خداوند عالم نے عذاب (جہنم کی آگ کو) واجب قرار دیا ہے اور صغیرہ گناہ وہ ہیں جو کوئی خاص اہمیت نہ رکھتے ہوں۔ بعض احادیث میں گناہانِ کبیرہ کی تعداد سات ہے اور بعض احادیث میں بیس اور بعض میں ستّر ذکر ہوئے ہیں، یہ اعداد شاید گناہ کے مدارج کی طرف اشارہ ہوں۔

۴۔ ناسخ ومنسوخ اور ان کا فلسفہ

ان دو موضوعات میں بعض مفسرین کے لیے شاید بہت حیرت انگیز بحث موجود ہو، اور شاید تعجب کریں کہ قرآن مجید میں ناسخ ومنسوخ کا وجود کس طرح ہے؟ اس سے مراد ایک ایسا حکم آئے جو دوسرے حکم کو منسوخ کر دے۔ جیسے بیت المقدس کی طرف سے خانۂ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم۔

قوانین میں ناسخ ومنسوخ کے وجود کو بنانا اور آراستہ کرنا انسانوں کی سوچ اور فکر ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، کیوں کہ ممکن ہے کہ آج قانون بنالیں اور دوسرے دن غلطیوں کی وجہ سے ختم کر دیں، اسے نسخ کریں، لیکن یہ چیز احکام الٰہی میں کیسے تصور کی جاسکتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں صرف ایک جملہ کہا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ خداوند عالم کے علم اور آگاہی کی کوئی حد نہیں اور کبھی تبدیل نہیں ہوتا، لیکن کچھ موضوعات میں زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تغیر آجاتا ہے۔

مثال کے طور پر بیمار شخص کے لیے ممکن ہے، کوئی مخصوص دوا آج نفع بخش اور مفید ہو مگر چند روز گزرنے کے بعد یہی دوا بیمار کے لیے نقصان دہ اور خطرناک بھی ہوسکتی ہے اور ایک اچھا ڈاکٹر دوا کو آج استعمال کرنے کے لیے دیتا ہے، چند روز کے بعد بیمار کی دوا بدل دیتا ہے اور اس کا استعمال ممنوع قرار دیتا ہے اور قبلے والی اور اس جیسی دیگر مثالوں میں مقصد یہی ہے کہ ممکن ہے بیت المقدس میں پڑھی جانے والی ایک دن کی نماز میں بھلائی زیادہ ہو، کیوں کہ خانۂ کعبہ ان دنوں بتوں کا مرکز بنا ہوا تھا اور قومیت کا رنگ بھی غالب تھا۔ اگر شروع ہی سے کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی تو زیادہ مشکلات کا

---

[۱] تفسیر نور الثقلین، ج۱، ص ۴۷۳

سامنا کرنا پڑتا لیکن تیرہ سال بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے سے اسلام و مسلمین سے بت پرستی کا زنگ دُھل گیا اور جب ہجرت کے بعد مدینے میں توحید کے پہلے گھر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے تو اس میں اسلام اور مسلمین کے لیے بہت سی مصلحتیں تھیں اور نقصان کچھ بھی نہیں۔ نسخ کے تمام موارد حقیقت میں اسی طرح ہیں۔ البتہ نسخ کی بحثیں بہت زیادہ وسیع ہیں۔ لیکن یہاں مزید گفتگو کی گنجائش نہیں، ہمارا مقصد صرف فلسفۂ نسخ کے بنیادی اصول کو بیان کرنا تھا۔ [1]

۵۔ قرآن مجید کے واقعات اور خوبصورت مثالیں

قرآن مجید کا ایک اہم حصہ گزشتہ امتوں کے واقعات اور خصوصاً انبیاء علیہم السلام کے حالات پر مشتمل ہے، جو کہ ہر زمان و مکان کے لوگوں کے لیے عبرت ناک واقعات اور نمونۂ عمل کی داستانوں اور بہترین تجربات سے مزیّنہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں ان سے مربوط واقعات کو نقل کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی ایک پیغمبر کی تاریخ جیسے حضرت ابراہیم، نوح، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام کا قرآن کے مختلف سوروں میں تکرار کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ نہ صرف تکرار بلکہ مختلف زاویوں سے اس کی وضاحت بھی ہوئی ہے ارشاد ہوتا ہے:

"لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ" [2]

ان داستانوں میں عقل مندوں کے لیے عبرتناک واقعات موجود ہیں۔ تاریخ کے علاوہ اس جہاں کے کونے کونے میں انسانوں کو سابقہ اقوام کی بچی کچھی تاریخ جو ابھی تک زندہ اور موجود ہے، اس کی طرف قرآن کریم دعوت دیتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

"قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلُ" [3]

''(اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ ذرا رُوئے زمین پر چل پھر کر دیکھو تو کہ جو لوگ اس کے قبل گزر گئے ان (کے افعال) کا انجام کیا ہوا۔''

قرآن مجید ان تاریخوں اور واقعات کے ضمن میں بہت سی مثالوں کے ذریعے انسانوں کی ہدایت اور مدد کرتا ہے اور یہ مثالیں بعض انسانوں کی اصل اور واقعی زندگی کے لیے نمونے ہیں۔ کبھی طبیعی کاموں میں سبزہ زار اور حیوانات کی تشبیہات ہیں، ان مثالوں میں بے انتہا کشش، اثر پذیری اور زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہیں اعجازِ قرآن میں

---

[1] تفسیر نمونہ: جلد ۱، ص ۳۹۰۔ سورۂ بقرہ: آیت ۱۰۶

[2] سورۂ یوسف: آیت ۱۱۱

[3] سورۂ روم: آیت ۴۲

سے قرار دیا جاسکتا ہے، اسی طرح قرآن مجید کہتا ہے:

"وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ"[1]

''اور ہم نے تو اس قران میں لوگوں کے (سمجھانے کے) واسطے ہر طرح کی مثل بیان کر دی تا کہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔''

ان مثالوں میں تدبر و تفکر کرنا عقل مندوں کی بیداری کی علامت ہے۔ امیر المؤمنینؑ نے مذکورہ بیان کو جامعیت قرآن کریم کا نام دیتے ہوئے، خصوصاً اس نکتے پر زور دیا اور تمام مسلمانوں کی اس طرف توجہ دلائی ہے۔

پندرہواں حصّہ

وَ فَرَضَ عَلَيْكُمْ حَجَّ بَيْتِهِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلَهُ قِبْلَةً لِلْأَنَامِ يَرِدُونَهُ وُرُودَ الْأَنْعَامِ وَ [يَوْلَهُونَ] يَأْلَهُونَ إِلَيْهِ [وَلَهَ] وُلُوهَ الْحَمَامِ وَ جَعَلَهُ سُبْحَانَهُ عَلَامَةً لِتَوَاضُعِهِمْ لِعَظَمَتِهِ وَ إِذْعَانِهِمْ لِعِزَّتِهِ وَ اخْتَارَ مِنْ خَلْقِهِ سُمَّاعًا أَجَابُوا إِلَيْهِ دَعْوَتَهُ وَ صَدَّقُوا كَلِمَتَهُ وَ وَقَفُوا مَوَاقِفَ أَنْبِيَائِهِ وَ تَشَبَّهُوا بِمَلَائِكَتِهِ الْمُطِيفِينَ بِعَرْشِهِ يُحْرِزُونَ الْأَرْبَاحَ فِي مَتْجَرِ عِبَادَتِهِ وَ يَتَبَادَرُونَ عِنْدَهُ مَوْعِدَ مَغْفِرَتِهِ جَعَلَهُ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالَى لِلْإِسْلَامِ عَلَمًا وَ لِلْعَائِذِينَ حَرَمًا [وَ] فَرَضَ حَقَّهُ وَ أَوْجَبَ حَجَّهُ وَ كَتَبَ [عَلَيْهِ] عَلَيْكُمْ وِفَادَتَهُ فَقَالَ سُبْحَانَهُ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَ مَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ.

''پروردگار نے تم لوگوں پر حج بیت الحرام کو واجب قرار دیا ہے جسے لوگوں کے لیے قبلہ بنایا ہے اور جہاں لوگ پیاسے جانوروں کی طرح بے تابانہ وارد ہوتے ہیں اور ویسا اُنس رکھتے ہیں جیسے کبوتر اپنے آشیانے سے رکھتا ہے۔ حج بیت اللہ کو مالک نے اپنی عظمت کے سامنے جھکنے کی علامت اور اپنی عزت و تکریم کی نشانی قرار دیا ہے۔

اُس نے مخلوقات میں سے اُن بندوں کا انتخاب کیا ہے جو اُس کی آواز سن کر لبیک کہتے ہیں اور اس کے کلمات کی تصدیق کرتے ہیں۔ انہوں نے انبیاءؑ کے مواقف میں وقوف کیا ہے اور طواف عرش کرنے والے فرشتوں کا انداز اختیار کیا ہے۔ یہ لوگ اپنی عبادت کے معاملے میں برابر فائدے حاصل کر رہے ہیں اور مغفرت کی وعدہ گاہ کی طرف تیزی سے سبقت کر رہے ہیں۔ پروردگار نے کعبے کو اسلام کی نشانی اور بے پناہ افراد کی پناہ گاہ قرار دیا ہے۔ اس کے حج کو فرض کیا ہے اور اس

[1] سورۂ زمر: آیت ۲۷

کے حق کو واجب قرار دیا ہے۔تمہارے اوپر اس گھر کی حاضری کو لکھ دیا ہے اور صاف اعلان کر دیا ہے کہ ''اور لوگوں پر واجب ہے کہ محض خدا کے لیے خانہ کعبہ کا حج کریں جنہیں وہاں تک پہنچنے کی استطاعت (قدرت) ہو اور جس نے باوجود قدرت حج سے انکار کیا تو (یاد رکھیے کہ) خدا سارے جہاں سے بے پرواہ ہے۔''

شرح وتفسیر

خطبے کا آخری حصّہ، حج کی عظمت

یہ بات واضح نہیں کہ امیر المومنینؑ نے عظمتِ قرآن بیان کرنے کے بعد خطبے کے کون سے حصّے میں احکامِ دین کے بارے میں اشارہ فرمایا ہے ہیں،لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ سیّد رضیؒ جنہوں نے نہج البلاغہ کی جمع آوری کی ہے،ان کا مقصد خطبوں کو بطورِ کامل ذکر کرنا نہیں تھا، بلکہ ہر خطبے سے چیدہ چیدہ حصوں کو جمع کرنا تھا، بہر حال یہاں پر مسئلۂ حج جو اسلامی وظائف اور ضروری ذمّے داریوں میں سے ایک ہے، وہ بھی ایسے خطبے میں کہ جس میں دنیا کی خلقت کا آغاز اور مختلف مراحل سے انسان کے گزرنے کے واقعات کو حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور تک کو محورِ بحث قرار دیا گیا ہے، ایک مخصوص معنی و مفہوم کی طرف اشارہ ہے کہ حج بیت اللہ، اسلام کا خلاصہ ہے۔

اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے، جن میں انفرادی، اجتماعی، تربیتی، اَخلاقی اور سیاسی مسائل سرفہرست ہیں۔شروع میں، مسئلہ حج کے وجوب کے بارے میں بات کرتے ہوئے بہت دقیق اور باریکیوں کے ساتھ خوبصورت تعبیرات اور مثالوں کے ذریعے گفتگو فرماتے ہیں اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو اس عظیم فریضے کا شوق دلاتے ہوئے فرماتے ہیں: ''وَ فَرَضَ عَلَيْكُمْ حَجَّ بَيْتِهِ الْحَرَامِ'' خداوند عالم نے اپنے محترم گھر کے حج کو تم سب پر واجب کر دیا ہے اور پھر خانہ کعبہ کی تعریف وتوصیف میں فرماتے ہیں، وہ گھر جسے خدا نے تمام انسانوں کے لیے قبلہ قرار دیا ہے: ''اَلَّذِيْ جَعَلَهُ قِبْلَةً لِلْاَنَامِ''[1] ہم ہر روز صبح وشام کئی مرتبہ اُس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور جماعت کی صفوں کا مرکزی دائرہ دراصل دنیا کے تمام مسلمانوں کی وحدت کا راز ہے۔خانۂ الٰہی کی دوسری توصیف یہ ہے کہ یہ مقدّس مکان

---

[1] ''انام'' سے مراد انسان (جمع) ہیں اور اس سے بعض نے ''صاحبِ عقل مخلوق'' مراد لی ہے (چاہے وہ انسان ہوں یا جنات ہوں) پہلے معنی کی بنیاد پر جملے کا مفہوم یہ ہے کہ ''حج صرف انسانوں سے متعلق ہے'' اور دوسرے معنی کی بنیاد پر حج جن وانس دونوں کے لیے ہے بعض اہلِ نظر کے مطابق ''انام'' کی اصل ''ونام'' ہے جس کے معنیٰ ''آواز دینا'' ہے، لہٰذا اس سے مراد یا تو تمام ''ذی روح موجودات'' ہیں یا پھر صرف ''جن وانس'' مراد ہیں۔(تاج العروس مادّۂ انم)

عشقِ الٰہی سے سرشار لوگوں کو حقیقی حج کے مراسم کی ادائیگی کے لیے اپنی طرف دعوت دیتا ہے۔

مولا علی علیہ السلام اس مکان کی یوں تعریف فرماتے ہیں:

"یَرِدُوْنَهٗ [۱] وُرُوْدَ الْاَنْعَامِ وَیَاْلَهُوْنَ [۲] اِلَیْهِ وُلُوْهَ الْحَمَامِ [۳]"

''اطراف واکنافِ عالم سے جس طرح پیاسے اپنی پیاس بجھانے کے لیے پانی تک پہنچ جاتے ہیں، اسی طرح لوگ اس گھر کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں، اور کبوتروں کی طرح وہاں پناہ لیتے ہیں۔''

حقیقت میں وہ لوگ جو حج کے معنی کو اچھی طرح جانتے ہیں، وہ اسی طرح سے خانۂ خدا کی زیارت کو آتے ہیں؛ اور اپنے قلب وروح کو اس طریقے سے پاک و پاکیزہ کرتے ہیں اور اپنے پورے وجود سے حج کی معنویت اور روحانیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، نیز شر شیاطین، ہوائے نفسانی اور گناہوں کی بلاؤں سے چھٹکارا پانے کے لیے خانۂ کعبہ جا کر پناہ لیتے ہیں؛ عاشقانہ انداز میں لبیک کی آوازیں بلند کرتے ہیں، صفا ومروہ کے درمیان ایسے سعی کر رہے ہوتے ہیں جیسے مجنون؛ ایسا لگتا ہے جیسے شمع کے گرد پروانے چکر کاٹ رہے ہیں۔

حاجیوں کی انعام سے تشبیہ یا تو حجاجِ بیت اللہ کی غیر معمولی تواضع وانکساری کی وجہ سے ہے یا بیت اللہ کی طرف طواف کے لیے تیزی کے ساتھ لپکنے نیز خانہ خدا کی زیارت کے لیے بے قراری اور بے تابی کی کیفیت کی جانب اشارہ ہے۔ اس طرح کی تعبیرات عرب میں اور معنی رکھتی ہیں، جبکہ ہمارے یہاں اس کے معنی کچھ اور ہیں، کبوتر کی مثال، محبت، صلح اور امن نیز رغبت کے ساتھ شوقِ وصال کی علامت کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ حج کا آغاز احرام اور تلبیہ "لَبَّیْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ" کہنا ہے اور یہی لبیک ہے کہ جس کا مفہوم دعوتِ الٰہی کو قبول کرنا ہے۔

جی ہاں! خداوند عالم نے اپنے گھر کے زائرین کو ایک وسیع وعریض مہمان سرا میں دعوت دی ہے اور وہ لبیک کہتے

---

[۱] ''یردون'' مادّہ ''ورود'' سے ہے، دراصل اس کے معنی ''پیاسے حیوانات کا پانی کے گھاٹ پر آنا'' ہے۔ پھر کسی بھی جگہ ہر طرح سے داخل ہونے پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔

[۲] یالھون، بعض نے اسے الہ، الوھا کے مادّے سے عبادت کے معنی میں لیا ہے۔ بنابرایں یالھون یعنی عبادت کرتے ہیں، اور کبھی یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تحیر کے معنی میں آیا ہے، کیوں کہ جس وقت انسان ذات وصفاتِ پروردگار کے بارے میں سوچتا ہے تو وہ متحیر ہو جاتا ہے اور کبھی یہ کہا گیا ہے کہ اس کا اصلی مادّہ ولہ ہے کہ اس میں واو ہمزے میں بدل گیا ہے (اوپر جاری جملے ولوہ کی مثال مفعول مطلق کی صورت میں ہونا اس معنی کے لیے مؤید بھی ہے۔ خود اس لفظ کے معنی پناہ لینا ہیں اور شوق سے گریہ وزاری کرنے کے ہیں۔

[۳] حمام، ح پر فتحہ کے ساتھ کبوتر کے معنی ہیں اور حمام، ح زیر کے ساتھ موت کے معنی دیتا ہے اور مذکورہ بالا عبارت میں پہلا معنی مراد ہے۔

ہوئے دلی شوق اور عشق سے سرشار، اُس ذات سے ملاقات کی اُمنگ لیے اس گھر کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور اس کی قربت میں سکون محسوس کرتے ہیں اور ان کے اوپر پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ تقویٰ و معنویت کے اعتبار سے دل اور جان میں تازگی محسوس کرتے ہیں۔ پس! حج کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَ جَعَلَهُ سُبْحَانَهُ عَلَامَةً لِتَوَاضُعِهِمْ لِعَظَمَتِهِ وَ اِذْعَانِهِمْ لِعِزَّتِهِ"

''خداوند عالم نے حج کو اپنی عظمت کے سامنے علامت انکساری قرار دیا ہے اور اسے اپنی عزت کے اعتراف کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے۔''

کیوں کہ مناسکِ حج وہ عاجزانہ اعمال ہیں جو حق سبحانہٗ کی بارگاہ میں انجام پاتے ہیں۔ عبادتوں میں سے کسی اور عبادت میں حج کے فریضے کی طرح تواضع و انکساری نمایاں نہیں ہے۔ تمام لباسوں، مال و دولت، زیور، جاہ و حشم، اقتدار و بادشاہت، سب کو چھوڑ کر احرام باندھنا اور بغیر سلے ہوئے دو کپڑے کے ٹکڑوں پر قناعت کرتے ہوئے خانۂ خدا کے گرد طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی، عرفات و منیٰ و مشعر میں وقوف، شیاطین پر پتھر مارنا، سر منڈوانا، یہ سب ایسے اعمال ہیں، جو پروردگار کی عظمت کے سامنے انتہائی تواضع کے انداز میں انجام پاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ عمل ہر انسان کے غرور و تکبّر اور بڑے پن کو پاؤں تلے روند ڈالتا ہے۔ اور پھر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حاجیوں اور زائروں کی صفوں میں ہونا ایک اعزاز ہے، اور یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ خدا نے اپنے بندوں میں سے ایک گروہ کو یہ توفیق عطا کی، اور فرمایا:

"وَ اخْتَارَ مِنْ خَلْقِهِ سُمَّاعاً[1] اَجَابُوْا اِلَيْهِ[2] دَعْوَتَهُ وَ صَدَّقُوْا كَلِمَتَهُ"

''پروردگار نے اپنی مخلوقات میں سے ایسے سننے والوں کو منتخب کیا ہے کہ جو اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اس کی دعوت کو قبول کرتے ہیں اور اس طرح اُس ذاتِ پاک کے کلمے کی تصدیق کرتے ہیں۔''

احادیثِ مبارکہ میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام جب خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے خانۂ خدا کی بنیاد رکھ چکے، تو خداوند متعال نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ لوگوں کو بلند آواز سے حج کی طرف دعوت دو، آپؑ نے عرض کی: پروردگارا! میری آواز ان تک کیسے پہنچے گی؟ خداوند عالم نے فرمایا: آپ آواز بلند کریں پہنچانا میرا کام ہے، حضرت ابراہیمؑ خانۂ کعبہ سے ملحق ایک اونچے ٹیلے پر چلے گئے۔ وہ مقام (خدا کے اذن سے) اتنا بلند ہوا کہ تمام اشیاء حتیٰ کہ پہاڑوں سے بھی کہیں زیادہ اونچائی پر پہنچ گیا اور پھر آپؑ نے کانوں میں انگلیاں ڈالیں اور اونچی آواز میں مغرب و مشرق کی جانب رخ

---

[1] سمّاع، طلاب کے وزن پر، سامع کی جمع ہے جیسے طالب کی جمع طلاب ہے۔

[2] ''اَجابُوا اِلَیہِ، ضمیر الیہ خانۂ کعبہ کی طرف یا ذاتِ خدا کی طرف پلٹتی ہے، دونوں صورتوں میں جملے کے مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں آئے گا۔

کر کے صدا دی:

"اَیُّهَا النَّاسُ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْحَجُّ اِلَی الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ فَاَجِیْبُوْا رَبَّکُمْ [۱]"

''اے لوگو! خانۂ خدا کا حج تم پر واجب کر دیا گیا ہے، خدا کی دعوت کو قبول کرو'' اور حج بیت اللہ کے لیے چلے آؤ۔''

ہر طرف ان کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس معجز نما آواز کے بلند ہوتے ہی دنیا کے گوشے گوشے میں ہل چل مچ گئی اور سات سمندر پار کے لوگ، مشرق و مغرب میں رہنے والے، زمین کے آخری گوشے تک کے لوگ، یہاں تک کہ صلبِ پدر اور رحم مادر میں موجود بچوں نے بھی حضرت ابراہیمؑ کی آواز کو حکمِ خدا سے سنا اور سب نے یک زبان ہو کر کہا: "لَبَّیْکَ اللّٰهُمَّ لَبَّیْکَ" بعض روایتوں میں آیا ہے کہ جس نے صدائے ابراہیم خلیلؑ پر جتنی بار لبیک کہا ہے، اتنی ہی مرتبہ وہ حج بیت اللہ انجام دے سکے گا اور جن کو لبیک کہنے کی توفیق نہیں ہوئی، ان کے نصیب میں حج خانۂ خدا نہیں ہوگا۔ [۲]

مولاؑ ایک بار پھر حج کے فلسفے اور اس کے تربیتی اثرات اور نشانیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَوَقَفُوْا مَوَاقِفَ اَنْبِیَائِهٖ وَتَشَبَّهُوْا بِمَلَآئِکَتِهِ الْمُطِیْفِیْنَ بِعَرْشِهٖ"

''خانۂ خدا کا حج کرنے والے پیغمبروںؑ سے مشابہ نظر آتے ہیں، ان ہستیوں کی طرح مختلف مقامات پر ''وقوف'' کرتے ہیں، گویا فرشتے ہیں، جو عرشِ الٰہی کے گرد چکّر لگا رہے ہوں۔''

''مواقفِ انبیاءؑ'' کی تعبیر اس لیے ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد انبیاؑ کی کافی تعداد اور بعض روایات کے مطابق آپؑ سے پہلے بھی انبیاؑ اس مقدّس مکان کی زیارت کے لیے تشریف لاتے رہے ہیں۔ [۳]

فرشتوں سے اس لیے تشبیہ دی ہے کہ خداوند متعال نے خانۂ کعبہ کے بالکل اُوپر آسمانوں میں ایک گھر بنایا ہے اور فرشتے اُس گھر کے گرد طواف کرتے ہیں [۴]۔

آثار و اَسرارِ حج کے موضوع کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یُحْرِزُوْنَ [۵] الْاَرْبَاحَ فِیْ مَتْجَرِ عِبَادَتِهٖ وَیَتَبَادَرُوْنَ عِنْدَهٗ مَوْعِدَ مَغْفِرَتِهٖ"

---

[۱] نور الثقلین، جلد ۳، ص ۲۸۸، حدیث ۴۷

[۲] شرح نہج البلاغہ، جلد ۲، ص ۲۴۹ میں مرحوم خوئی نے کافی سے نقل کیا ہے، بحار الانوار، جلد ۹۶، ص ۱۸۷

[۳] احادیث میں آیا ہے کہ خدا کے وہ انبیاؑ جنھوں نے خانۂ الٰہی کی زیارت فرمائی، اُن میں حضرت آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، یونسؑ، عیسیٰؑ، سلیمانؑ نیز پیغمبر اسلامؐ شامل ہیں۔ شرح نہج البلاغہ خوئی، جلد ۲، ص ۲۵۲۔

[۴] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۱، صفحہ ۱۲۴

[۵] ''یحرزون'' احراز کے مادّے سے ہے۔ اس کے معنی حفاظت کرنا اور جمع کرنا ہے۔ اسی لیے حرز ایسی جگہ کو کہتے ہیں جو صندوق یا گودام کی طرح محفوظ ہو۔

حجاج عبادتِ الٰہی کے اس تجارتی مرکز سے بہت زیادہ نفع کماتے ہیں اور معافی و مغفرت کی وعدہ گاہ تک پہنچنے میں جلدی کرتے ہیں۔

"یُحْرِزُوْنَ" سے مراد جمع کرنا، "اَلْاَرْبَاحَ" سے مراد منافع، اور "مَتْجَرِ" سے مراد تجارتی مرکز ہے۔ یہ سارے الفاظ ایسے لطیف وظریف تعبیرات ہیں کہ جن کے ذریعے معنویت سے سرشار اس مہم ترین اسلامی پروگرام کو روزمرہ کی ایک معمولی اور عام فہم مثال سے تشبیہ دے کر ہر ایک کو اسے سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا کردی ہے۔ اس (حج) سے زیادہ بہترین تجارت اور کون سی ہوگی اور اس سے زیادہ عظیم عمل کون سا ہوگا کہ جو اگر صحیح طرح سے انجام پا گیا، تو انسان تمام گناہوں سے پاک ہو جائے گا، بالکل ایسے، جیسے ابھی شکمِ مادر سے معصوم بچہ پیدا ہوا جیسا کہ احادیثِ مبارکہ میں ایسا ہی بیان ہوا ہے۔ آپؑ مزید فرماتے ہیں:

"جَعَلَهُ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالٰی لِلْاِسْلَامِ عَلَمًا وَ لِلْعَائِذِیْنَ حَرَمًا"

''خداوند متعال نے اس گھر کو اسلام کے لیے ایک پرچم (یا علامت) اور پناہ لینے والوں کے لیے جائے امن قرار دیا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ خانۂ کعبہ اسلام کا وہ عظیم پرچم ہے، جو ہمیشہ آب و تاب کے ساتھ لہراتا رہے گا۔ اور مسلمان اطراف واکنافِ عالم سے اس کے گرد جمع ہوتے ہیں اور اپنے استقلال وعظمت اور عزت کو اعمالِ حج کے مرہون منت سمجھتے ہیں اور ہر سال خانۂ خدا کا دیدار، مسلمانوں کے پیکر میں نئی روح پھونکتا ہے، جو اُن کی رگوں میں تازہ خون کی طرح سرایت کرتا رہتا ہے۔ اس طرح ان تمام فضائل اور اسرارِ حج کے بیان کے ذریعے، خانۂ خدا کی زیارت کے واجب ہونے کی جانب متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَرَضَ حَقَّهُ وَ اَوْجَبَ حَجَّهُ وَ کَتَبَ عَلَیْکُمْ وِفَادَتَهُ[1] فَقَالَ سُبْحَانَهُ وَلِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا وَ مَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ"

''خداوند متعال نے اس کا حق تم پر واجب، اور اس کے حج کو لازم کر دیا ہے، تم سب کو اس کی زیارت اجتماعی طور پر کرنی ہے۔ سو، وہ لوگ جو استطاعت رکھتے ہیں، اُن سب پر لازم ہے کہ خدا کے گھر کا قصد کریں، اگر کسی نے انکار کیا اور حج کو ترک کیا تو (اس نے اپنا نقصان کیا) اللہ تعالیٰ سب سے بے نیاز ہے۔''

---

[1] ''وفادۃ'' کے بنیادی معنی طلوع کرنا اور ظاہر ہونا ہے اور پھر بعد میں یہ لفظ ''نزول'' اور ''ورود'' کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا ہے۔ وفد ایسے گروہ کو کہتے ہیں، جو کسی ملک کے دورے پر جاتا ہے یا کسی حاکم، فرد یا صاحب حیثیت گروہ سے ملاقات کے لیے آتا اور جاتا ہے۔

نکات

مسائلِ حج کی بحثیں بہت زیادہ ہیں۔ان سب کو بیان کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے، ہم یہاں پر چند اہم نکات کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔خانۂ کعبہ کی تاریخ

یہ گھر جس کا دوسرا نام بیت اللہ الحرام ہے۔[۱] اس کی تاریخ بہت تفصیلی ہے، روایات کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے کو جب ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جنہوں نے اس مکان کی بنیاد رکھی وہ حضرت آدمؑ تھے اور اس کے طواف کے لیے آیا کرتے تھے؛ طوفانِ نوحؑ میں یہ گھر ویران ہو گیا تھا؛ بعد میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مدد سے اسے دوبارہ تعمیر کیا؛ جس پر قرآن مجید کی آیا بڑی صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہیں جیسے:

"وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ"[۲]

''اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے۔''

"إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ"[۳]

''روئے زمین پر سب سے پہلے اسی گھر کو بنی نوع انسان کے لیے توحید کا مرکز قرار دیا گیا۔''

لوگوں کے لیے عبادت کے واسطے جو گھر سب سے پہلے بنایا گیا، تو یقیناً وہ یہی کعبہ ہے جو مکے میں ہے، یہ بڑی خیر و برکت والا گھر ہے اور پوری دنیا کے لوگوں کے لیے رہنما ہے۔اور یہ تمام انسانوں کے لیے یکتا پرستی کا سب سے پہلا گھر قرار دیا گیا۔اور جس طرح پہلے ذکر ہوا کہ روایات کے مطابق آسمانوں میں بھی خانہ کعبہ جیسا مرکز فرشتوں کے طواف اور عبادت کے لیے موجود ہے۔یہاں تک کہا جاتا ہے کہ خانہ کعبہ کی جگہ خشکی کا وہ پہلا نقطہ محل،، مرکز اور نشان ہے، جسے پانی کے نیچے سے اوپر لایا گیا۔[۴] "دَحْوُ الْاَرْض" کا واقعہ بھی اسی حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ ابتدا میں رُوئے زمین کا پورا خطہ بارشوں اور سیلابوں کی وجہ سے پانی کے نیچے ڈوبا ہوا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ بعض علاقوں میں آہستہ آہستہ پانی کی سطح کم ہونے لگی

---

[۱] بحار الانوار: جلد ۱۲، ص ۸۶

[۲] سورۂ بقرہ: آیت ۱۲۷

[۳] سورۂ آلِ عمران: آیت ۹۶

[۴] شرح نہج البلاغہ خوئی: جلد ۲، ص ۲۳۵

اور خشکی کا حصّہ پانی سے باہر نمودار ہو گیا، جس میں سب سے پہلے خانۂ خدا کا مقام پانی سے باہر آیا تھا۔

خانۂ کعبہ کی عظمت اور اہمیت کے سلسلے میں وافر تعداد میں روایات، نہج البلاغہ اور دوسری کتابوں میں وارد ہوئی ہیں، ان میں سے ایک حدیث حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، فرماتے ہیں:

"مَا خَلَقَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ بُقْعَةً فِي الْاَرْضِ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْهَا ، ثُمَّ اَوْمَأَ بِيَدِهِ نَحْوَ الْكَعْبَةِ.وَلَا اَكْرَمَ عَلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ مِنْهَا"

''خداوند متعال کی نظر میں زمین پر کوئی مقام ایسا نہیں جو اُسے خانۂ کعبہ سے زیادہ محبوب ہو۔ اس کے بعد امامؑ نے ہاتھ سے کعبہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''اور اس مقام سے زیادہ مکرم کوئی جگہ خدا کی نظر میں نہیں۔''

اس حدیث کے شروع میں یہ جملہ بھی ذکر ہوا ہے کہ: "اِنَّ النَّظَرَ اِلَيْهَا عِبَادَةٌ" اس گھر کی طرف نگاہ کرنا بھی عبادت ہے۔[1]

خانۂ کعبہ وحدتِ مسلمین کی علامت ہے اور پوری دنیا میں عبادت گزاروں کی صبح و شام قائم ہونے والی جماعتوں کی صفوں کا مرکزی دائرہ ہے۔ خانۂ کعبہ، مسلمینِ جہاں کا بہت بڑا اجتماعی مرکز ہے اور سال کے بارہ مہینوں میں ان کی سربلندی اور عظمت کے لیے اہم ترین تربیت گاہ ہے کہ جہاں ساری دنیا سے مسلمان آتے ہیں اور معنوی اور مادّی اعتبار سے اس گھر کے غیر معمولی فیوض اور برکات سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام کے بزرگ صحابی حضرت زرارہؓ نے ایک دن حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا:

"جَعَلَنِيَ اللهُ فِدَاكَ اَسْئَلُكَ فِي الْحَجِّ مُنْذُ اَرْبَعِيْنَ عَامًا فَتُفْتِيْنِيْ"

میری جان آپؑ پر فدا ہو، چالیس سال سے احکامِ حج سے متعلق آپؑ سے سوال پوچھتا آ رہا ہوں اور آپؑ جواب مرحمت فرماتے ہیں، (لیکن سوال و جواب کا یہ سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا!) امامؑ نے جواب میں فرمایا:

"يَا زُرَارَةُ بَيْتٌ يُحَجُّ اِلَيْهِ قَبْلَ آدَمَ بِاَلْفَيْ عَامٍ تُرِيْدُ اَنْ تَفْنِيَ مَسَائِلُهُ فِيْ اَرْبَعِيْنَ عَامًا"

''اے زرارہؓ! خلقت آدمؑ سے دو ہزار سال پہلے سے جس گھر کی زیارت اور حج کے مراسم انجام پاتے رہے ہیں، تم چاہتے ہو کہ اس کے مسائل چالیس سال میں ختم ہو جائیں۔''[2]

---

[1] فروع کافی: جلد ۴، ص ۲۴۰، باب فضل النظر الی الکعبۃ۔

[2] وسائل الشیعہ: جلد ۸، ص ۷، باب وجوب علیٰ کل مکلّف مستطیع۔

اس حدیث سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے پہلے زمین پر خانۂ کعبہ فرشتوں یا دوسری مخلوقات کی توجہ کا مرکز تھا کہ جو اُس وقت زندگی بسر کر رہی تھیں۔

۲۔ فلسفۂ حج

امیر المومنین علیہ السلام کے مذکورہ بالا کلام میں فلسفہ و اسرارِ حج کے بارے میں پُر معنی اشارے بیان ہوئے ہیں، اسلامی روایات میں بھی حج سے متعلق بہت سی سبق آموز اور تعلیمی و تربیتی پہلوؤں سے مالا مال مثالیں اور تعبیرات ملتی ہیں، مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حقیقت میں فریضۂ حج کے عظیم مناسک کے چار اہم پہلو (۱) اخلاقی اور بندگی (۲) سیاسی اور اجتماعی (۳) تہذیب و ثقافت (۴) اقتصادی اور معاشی ہیں۔

۱۔ اخلاقی اور بندگی کے پہلو

یہ فلسفۂ حج کے اہم ترین پہلوؤں میں سے ہے، جس میں نفوس کی تربیت، اَخلاقی تہذیب نیز تقویٰ اور خلوص کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے موضوعات درپیش ہیں۔ اس بارے میں ایک معروف مثال احادیث میں بیان ہوئی ہے:

"یَخْرُجُ مِنْ ذُنُوْبِهٖ کَهَیْئَتِهٖ یَوْمَ وَلَدَتْهُ اُمُّهُ"[۱]

''جو کوئی خدا کے گھر کا حج (اخلاص اور آداب و اَسرار کی رعایت کرتے ہوئے) انجام دے، وہ گناہ سے ایسا پاک ہوگا کہ گویا ابھی اس کی ماں نے اسے جنا ہو۔''

حج کے عمل سے انسان کی روح و جان پر جو اثر ہوتا ہے، اس کی یہ واضح دلیل ہے کہ یہ عمل انسان کو گناہوں کی تمام آلودگیوں سے پاک کر دیتا ہے اور ان گناہوں کے آثار کو ختم کر دیتا ہے جو ایک عرصے سے اس کے دل کو زنگ آلود کر رہے تھے اور یہ بہت بڑا فائدہ ہے جو بیت اللہ الحرام کے زوّار کو نصیب ہوتا ہے۔ اگر وہ مناسکِ اعمال و اَسرار کو توجہ اور تمام شرائط کے ساتھ ادا کرتا ہے تو اس کا ہر اٹھنے والا قدم اسے خدا کے نزدیک تر کر دیتا ہے اور ہر جگہ اپنے معبود اور محبوبِ حقیقی کو حاضر و ناظر پائے گا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ حج بیت اللہ الحرام گویا انسان کی نئی زندگی ہے جو اُسے پھر سے مل گئی ہے۔ جو کوئی حج کو اس کی تمام شرائط کے ساتھ پالے گا، تو معنویت اور روحانیت کے آثار وہ اپنے دل میں آخری عمر تک محسوس کرتا رہے گا اور شاید یہی وجہ ہے کہ حج تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ مسلمان پر واجب قرار دیا گیا ہے۔

---

[۱] بحار الانوار: جلد ۹۹، ص ۲۶

۲۔ سیاسی اور اجتماعی پہلو

جب بھی کوئی شخص ان مراسم کو جس طرح اسلام نے دستور دیا ہے اور بت شکن زمان حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دنیا والوں کو جس طرح حج کے لیے بلایا ہے، اُس طرح انجام دے، تو یہ مسلمین کی عزت، دین کی بنیادیں محکم، وحدتِ کلمہ، اور دشمنانِ اسلام کے مقابل قدرت وشوکت اور تمام مشرکین سے برأت کا سبب بنے گا۔ یہ عظیم الٰہی کانفرنس ہر سال خانۂ کعبہ کے جوار میں تشکیل پاتی ہے، اور مسلمانوں کو خود سازی، کردار سازی، برادرانہ تعلقات میں تقویت دینے اور دشمنانِ اسلام کے غلط پروپیگنڈوں اور الزام تراشیوں کو مسترد کرنے، اور ان کی شیطانی چال، مکر وفریب کو باطل کر کے دندان شکن جواب دینے کے لیے یہ عظیم مراسم بہترین فرصت مہیّا کرتے ہیں۔

حج ایک ایسا ہمہ جہت اور معجز نما منظر پیش کرتا ہے، جس میں ایک پُرشکوہ اجتماع، انتہائی جوش وجذبے کے ساتھ معنویات سے بھرپور، ایک ہی سمت میں حرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے اور سب یک صدا و یک جان ہو کر "لَبَّیْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ" کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ، ماشاء اللہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے انسانوں کے سمندر کا حیرت انگیز منظر پیش کرتے ہیں، جس کی کہیں کوئی مثال نہیں ملتی۔ مگر افسوس! مسلمان حج کی اس عظیم قدرت وطاقت کو اب تک پوری طرح اپنی روح کا حصّہ نہیں بنا پائے ہیں، ورنہ حج کی برکات وفیوضات کے توسّط سے ہر سال اسلام ومسلمین کے لیے بہت بڑی خدمات انجام دے سکتے ہیں اور نظامِ کفر پر کاری ضرب لگا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اسلامی روایات میں آیا ہے:

"لَا یَزَالُ الدِّیْنُ قَائِمًا مَا قَامَتِ الْكَعْبَةُ"۔[1]

''جب تک خانۂ کعبہ قائم ہے آئین اسلام بھی قائم ودائم ہے۔''

بعض دشمنانِ اسلام (جنہوں نے اسلام دشمنی کی قسم کھائی ہوئی ہے) حج کی عظیم قدرت وطاقت کو مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا ''مشکل کشا'' سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اس ''عظیم پلیٹ فارم'' کو غیر موثر یا کم اثر بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہتے ہیں (جیسے مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو ہوا دینا)۔

گلاڈسٹون

برطانیہ کے ایک سابق وزیر اعظم اور سیاستدان نے ایک عوامی جلسے میں اپنی ایک مشہور ومعروف تقریر میں کہا: جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام اذانوں میں صبح وشام اسی عظمت کے ساتھ یاد کیا جاتا رہے گا، اور قرآن مسلمانوں کی زندگی کا آئین بنا رہے گا، اور حج ہر سال اسی طرح شان وشوکت اور پُر وقار طریقے سے ہوتا رہے گا، تب تک اس دنیا کے

---

[1] فروعِ کافی، جلد ۴، ص ۲۷۱، باب انه لو ترك الناس الحج لجاءهم العذاب۔

مسیحیوں کے لیے بہت بڑا خطرہ بنا رہے گا، ہم دنیا میں اصلاح کرنے سے عاجز ہو جائیں گے۔(البتہ یہاں اصلاح سے مراد استعماری اصلاح ہے) [۱] بعض نے گلاڈسٹون کی بات کو اضافے کے ساتھ یوں بیان کیا ہے کہ اس نے اپنی تقریر میں یہ بات زور دے کر کہی ہے کہ تم مسیحی سیاستدانوں پر واجب ہے کہ مسلمانوں کی اذان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کو نکال دو انہیں رسولؐ کی یاد سے غافل کر دو، قرآن کو جلا دو، اور کعبے کو ویران کر دو۔

یورپ کے ایک عیسائی کا یہ جملہ بھی معروف ہے کہ وہ کہتا ہے: صد افسوس ہے مسلمانوں پر کہ اگر مسلمان حج کے معنی ومفہوم کو نہ سمجھ پائیں، اور جس دن مسلمانوں نے حج کو سمجھ لیا، اُس دن سے دوسروں کی بدنصیبی کا آغاز ہوگا۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ استعماری طاقتیں قرآن مجید کو ظاہری طور پر جلا نہیں سکتیں اور کعبے کو وہ کبھی ویران نہیں کر سکتے ہیں، ہاں یہ بات عین ممکن ہے کہ وہ مسلمانوں کی اجتماعی غفلت سے بھرپور فائدہ اٹھا کر احکام اسلامی کو مسخ کریں اور حج کے روح پرور مراسم کو بے روح بنا ڈالیں۔

۳۔تہذیبی وثقافتی پہلو

جیسا کہ اسلامی روایات و اخبار میں آیا ہے کہ حج بیت اللہ کا یہ عظیم اجتماع آثارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور چہاردہ معصومین علیہم السلام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے اور پھیلانے کا سبب بنتا ہے، اور تمام ممالک کے علمائے دِین، بڑے بڑے مسلمان دانشور، فن وادب کے اساتذہ، اسلام پر لکھنے اور بولنے والے جن کی اکثریت مختلف اسلامی ممالک میں کسی نہ کسی صورت مراسم اور اسلامی پروگراموں میں شرکت کرتی ہے ان کے لیے یہ بہترین فرصت ہے کہ حج کے فلسفے، اپنے افکار کے تبادلے، معلومات، اطلاعاتِ اسلامی کی فراہمی، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور چہاردہ معصومین علیہم السلام کے آثار کو زندہ کریں اور اس متحرک کاروانِ فکر وعمل کو مختلف معاشروں سے آئے ہوئے نمائندوں کے ذریعے دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچائیں۔

۴۔فلسفۂ حج کا اقتصادی پہلو

خطبے کے چوتھے حصّے میں حج کے فلسفۂ اقتصاد پر گفتگو کی گئی ہے جیسا کہ بعض اسلامی روایات میں بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ حج مسلمانوں کی اقتصادی قدرت وطاقت کو بڑھا سکتا ہے، مالی بدحالی اور پریشانیوں سے مسلمانوں کو نکال سکتا ہے، ممکن ہے کوئی سوچے، تصور کرے کہ حج کے مراسم کا اقتصادی مسائل سے کیا تعلق ہے؟ لیکن جب ہم اس نکتے پر غور کرتے ہیں کہ آج مسلمانوں کی اقتصادی وابستگی غیروں کے ساتھ خطرناک حد تک بڑھ چکی ہے، تو ایسی صورت میں مراسمِ حج کے ساتھ کانفرنسیں منعقد کر کے ان میں اقتصادی ماہرین کو بلا کر بڑے بڑے سیمینار تشکیل دینے میں کیا چیز مانع ہے؟ ایک عبادتِ الٰہی

---

[۱] رہنمائے حرمین شریفین: جلد ۱، ص ۵۴، نقل از گفتار ماہ۔

اوراس کے ساتھ غیر مسلموں کے چنگل سے مسلمانوں کی نجات کے عنوان سے اقتصادی مشکلات کے حل کے بارے میں غور و فکر کریں اور لائحہ عمل ترتیب دیں تا کہ مسلمانوں کو غیر سے وابستگی اور فقر و فاقہ سے نجات دلا سکیں۔

یہاں کوئی ذاتی مسئلہ نہیں ہے کہ کوئی اعتراض کر بیٹھے کہ ''جناب یہ تو دنیا پرستی ہے''، بلکہ ہدف و مقصد پوری اُمت مسلمہ اور عالم اسلام کی فکری اور عملی خود مختاری کا سوال ہے، نیز فقر و فاقہ سے نجات کا بین الاقوامی انسانی المیہ درپیش ہے۔ لہٰذا صرف اور صرف مسلمانوں کی خدمت اور اسلام کی سربلندی و تقویت مقصود ہے۔

مذکورہ بالا گفتگو کی روشنی میں مولا علیؑ کے کلام کی گہرائی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جو خطبے کے اس حصّے سے سمجھ میں آتا ہے۔ خانۂ خدا کا حج کرنے والوں کو عرشِ الٰہی کے گرد فرشتوں کے چکّر لگانے سے تشبیہ دی گئی ہے، نیز مولائے متقیانؑ اعمالِ حج کو خدا کے مقدس مکان میں خدا سے تجارت کرنے سے تشبیہ دے رہے ہیں کہ جس میں حاجیوں کے لیے انواع و اقسام کے (مادّی اور روحانی) فوائد پوشیدہ ہیں۔[1]

شاید یہی وجہ ہے کہ خطبے کے اس حصے میں صرف حج بیت اللہ الحرام کا ذکر کیا ہے، کیوں کہ یہ ایک ایسی عبادت ہے کہ جس میں سب کے لیے دنیا و آخرت کی اجتماعی، اَخلاقی اور معنوی، عظمت و شوکت نیز قدرت و طاقت کا سرچشمہ موجود ہے۔ اگرچہ حج کے حوالے سے بحث کا دامن اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، لیکن امام علیؑ نے نہج البلاغہ کے دوسرے خطبوں میں بھی حج کے مختلف مسائل بیان فرمائے ہیں، لہٰذا حج سے متعلق مزید وضاحت اُن خطبوں کے ضمن میں عرض کریں گے تا کہ اس کتاب کے تمام کلمات کا کماحقہٗ پیغام پہنچایا جا سکے۔

---

[1] ہشام بن حکم نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت نقل کی ہے کہ جس میں فلسفہ چہارگانہ اجمالاً ذکر ہوا ہے۔ وسائل الشیعہ، جلد ۸، ص ۹، فلسفۂ حج کے بارے میں مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ، جلد ۱۴ ملاحظہ کیجیے۔